File F:\Graphic1.tif not found.

شعروادب

حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری

علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ الْمُلُوْك
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اِک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلادیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری
سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمی گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اِک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

File F:\Graphic1.tif not found.

File F:\Front.tif not found.

اداریہ

اپنی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں!

شمس الحق ندوی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ: ''تم ایسے زمانہ میں ہو کہ اس وقت خواہشات علم کے تابع ہیں، لیکن عنقریب ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ علم خواہشات کے تابع ہوگا''۔ (یعنی جن چیزوں کو اپنا دل چاہے گا وہی علوم سے ثابت کی جائیں گی)۔

اس زمانہ میں مادیت اس زیب وزینت، شان وشکوہ اور جاہ وجلال سے جلوہ افروز ہے کہ روحانیت اور تزکیۂ باطن کے حس لطیف تک نظر پہنچنے پاتی، دائیں بائیں اور آگے پیچھے کا خوشنما منظر اس کا موقع ہی نہیں دیتا کہ خود اپنی طرف دیکھا جائے: ''وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ''۔

اس صورت حال میں علماء ومصلحین کو اپنے محاسبہ کے دن سے خاص طور سے ڈرنے کی ضرورت ہے، کہ ان کا محاسبہ بھی سخت ہے، اور ان کی ذمہ داری بھی بڑھی ہوئی ہے، اور قیامت کا دن جس میں یہ محاسبہ ہوگا، بڑا سخت دن ہوگا۔

جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوہریرہ سے فرمایا کہ: ''من قال لا الہ الا اللّٰہ دخل الجنۃ'' تو انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! کیا میں لوگوں کو اس کی خبر کردوں، تو آپ نے فرمایا: ہاں! انہوں نے کہا کہ آپ کوئی علامت دے دیجیے تاکہ میں کہہ سکوں کہ میں آپ کے پاس سے آرہا ہوں، اور آپؐ نے یہ فرمایا ہے، چنانچہ آپؐ کا جوتا لے کر چلے، اتفاق سے سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی، ان سے جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا تو حضرت عمرؓ نے ان کے سینہ پر ایسا زور کا دھکا دیا کہ وہ گر پڑے، وہ بارگاہِ نبویؐ میں شکایت کے لیے چلے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی ساتھ چلے، جب انہوں نے مارنے کی شکایت کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! لوگ پھر کلمہ پر اکتفا کرلیں گے، عمل میں کوتاہی کریں گے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس بات پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاموشی اختیار فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بڑی سوجھ بوجھ سے نوازا تھا، کئی موقعوں پر آپؓ کی رائے قابل عمل ہوئی، حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ''لو کان بعدی نبی لکان عمر'' یعنی ہمارے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔

چنانچہ حضرت انسؓ کی حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، حضرت انسؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ: کلمہ 'لاالٰہ' اللہ کی ناراضگی سے لوگوں کو محفوظ رکھتا ہے، جب تک کہ دنیا کی تجارت کو آخرت کی تجارت پر ترجیح نہ دیں، اور جب دنیا کی تجارت کو آخرت کی تجارت پر ترجیح دینے لگیں اور پھر لاالٰہ کہیں تو یہ کلمہ ان پر یہ کہہ کر لوٹا دیا جاتا ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، (یعنی تمہارا اقرار جھوٹا ہے، محض زبانی جمع خرچ ہے)۔

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص ''لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ'' کی گواہی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ملتا ہے، وہ سیدھا جنت میں جاتا ہے، جب تک کہ اس کے ساتھ دوسری چیز کو خلط نہ کردے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ یہ فرمایا، حاضرین میں سے ایک شخص نے عرض کیا، میرے ماں باپ آپ پر قربان! دوسری چیز خلط کرنے کا کیا مطلب ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: دنیا کی محبت اور اس کی ترجیح، اس کے لیے مال جمع کرنا، اور دنیا کی چیزوں سے خوش ہونا اور متکبر لوگوں کا سا عمل۔

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دنیا اس شخص کا گھر ہے جس کا آخرت میں گھر نہیں، اور دنیا اس شخص کا مال ہے جس کا آخرت میں مال نہیں، اور دنیا کے لیے وہ شخص مال جمع کرتا ہے جس کو بالکل عقل نہیں، علماء دین چونکہ ان باتوں سے واقف ہوتے ہیں، اس لیے ان کو اللہ تعالیٰ کا خوف ہوتا ہے: ''اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ'' یعنی علماء ہی اللہ سے ڈرنے والے ہیں، لیکن جب علماء حب دنیا کے سبب تاویلات کے جال میں پڑ جائیں، تو بڑے خطرہ کی بات ہے، ایسی کہ توبہ کی بھی توفیق نہ مل سکے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مفید ومؤثر کتاب 'فضائل صدقات' میں فرمایا: ''بعض بزرگوں کا ارشاد ہے کہ صحابۂ

کرام کے زمانہ میں شیطان نے اپنے لشکروں کو چاروں طرف بھیجا، وہ سب پھر پھرا کر نہایت پریشان حال اور تھکے تھکائے واپس ہوئے، اس نے پوچھا کیا حال ہے؟ وہ کہنے لگے کہ ان لوگوں نے تو ہم کو پریشان کر دیا، ہمارا کچھ بھی اثر ان پر نہیں ہوتا، ہم ان کی وجہ سے بڑی مشقت میں پڑ گئے، اس نے کہا گھبراؤ نہیں، یہ لوگ اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحبت یافتہ ہیں، ان پر تمہارا اثر مشکل ہے، عنقریب ایسے لوگ آنے والے ہیں جن سے تمہارے مقاصد پورے ہوں گے، اس کے بعد تابعین کے زمانہ میں اس نے اپنے لشکروں کو سب طرف پھیلا دیا، سب کے سب اس وقت بھی پریشان حال واپس ہوئے، اس نے پوچھا کیا حال ہے؟ کہنے لگے کہ ان لوگوں نے تو ہمیں دق کر دیا، یہ عجیب قسم کے لوگ ہیں، ہماری اغراض ان سے کچھ پوری ہو جاتی ہیں، مگر جب شام ہوتی ہے تو اپنے گناہوں سے ایسی توبہ کرتے ہیں کہ ہمارا کیا کرایا سب برباد ہو جاتا ہے، شیطان نے کہا گھبراؤ نہیں، عنقریب ایسے لوگ آنے والے ہیں جن سے تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی، وہ اپنی خواہشات میں دین سمجھ کر ایسے گرفتار ہوں گے کہ ان کو توبہ کی بھی توفیق نہ ہوگی، وہ بددینی کو دین سمجھیں گے''۔[فضائل صدقات: ج ۲/ص ۹۷]

بددینی کو دین سمجھیں گے، اس کی تشریح کی ضرورت نہیں، صحیح العقیدہ ایک عام مسلمان بھی اس کو جانتا ہے، قرآن وحدیث ہی اسلام کی طاقت اور اصل سرچشمہ ہیں جن سے ہمہ وقت طاقت حاصل کی جاسکتی ہے، اور جن کے ذریعہ سے ہر زمانہ میں مسلمانوں کے کمزور سے کمزور ڈھانچہ میں دینی روح پھونکی جاسکتی ہے۔

ہمیں غور اس پر کرنا چاہیے کہ اس سرچشمہ کو اگر اپنی خواہشات میں پڑ کر تاویلات کا راستہ بنالیا جائے، تو آخرت کی جوابدہی بڑی کٹھن ہوگی، ایک حدیث میں ہے کہ بعض لوگ قیامت کے روز اتنے زیادہ اعمال لے کر آئیں گے جیسا عرب ملک کے پہاڑ، لیکن وہ جہنم میں ڈال دیے جائیں گے، کسی نے پوچھا یارسول اللہ! کیا یہ لوگ نمازی ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نمازی بھی ہوں گے، روزہ دار بھی ہوں گے، بلکہ تہجد گذار ہوں گے، لیکن جب دنیا کی کوئی چیز دولت، عزت وغیرہ سامنے آجائے تو ایک دم اس پر ٹوٹ پڑیں گے، جائز وناجائز کی بھی پرواہ نہیں کریں گے۔

اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے تاویلات کے جال میں پڑنے سے بچائے کہ پھر تو توبہ کی بھی توفیق نہ ملے گی۔ ☆☆☆

دین الٰہی سے غفلت

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

دین الٰہی سے انحراف کا ایک عام سبب غفلت ہے، اللہ سے بے تعلقی اور اس کے احکام وفرائض کی طرف سے بے توجہی کا سبب ہمیشہ بغاوت وکفر ہی نہیں ہوتا بلکہ اکثر اوقات دنیا پرستی اور مادیت ہوتی ہے، عزت وجاہ کا سودا، دولت کا عشق اور معاش میں سرتاپا انہماک آدمی کو معاد سے بالکل غافل کر دیتا ہے، مادیت کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ سرے سے نجات کا خیال، رضائے الٰہی کے حصول کا شوق اور اس کے عذاب کا خوف دل سے بالکل نکل جاتا ہے، اور کھانے پینے اور پہننے کے سوا دنیا میں کوئی فکر باقی نہیں رہتی، خدا سے غافل لوگوں کی صحبت اور گناہوں اور عیش میں انہماک دل کو ایسا مردہ کر دیتا ہے کہ دینی اور اخلاقی حس باطل ہو جاتی ہے، نیک وبد اور حلال وحرام کی تمیز جاتی رہتی ہے، ایسے غافل اپنے اخلاق واعمال، سیرت وکردار، معاشرت وآداب اور وضع وصورت میں کافروں، اور اللہ کے باغیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں رہتے، شراب کے بے تکلف دور چلتے ہیں، منہیات ومحرمات کا آزادی سے ارتکاب کیا جاتا ہے، جرائم اور فسق وفجور میں نئی نئی ایجادات کی جاتی ہیں اور ان میں ایسی ذہانت اور ہنرمندی کا اظہار کیا جاتا ہے کہ پرانی امتیں ان کے سامنے مات ہو جاتی ہیں، شرع ودین کی کوئی حرمت باقی نہیں رہتی، ایسی خدا فراموشی اور خود فراموشی طاری ہو جاتی ہے کہ بھول کر بھی خدا یاد نہیں آتا اور اپنا بھی حقیقی ہوش نہیں رہتا۔ اسلام کی صحت کی دلیل یہ ہے کہ کفر اور اس کے پورے ماحول، اس کے تمام متعلقات، اس کی تمام خصوصیات اور شعائر سے نفرت پیدا ہو جائے اور اس کی طرف واپسی، اور اس میں مبتلا ہو جانے کے تصور سے آدمی کو تکلیف ہو، اور ایمان کی پختگی یہ ہے کہ وہ کفر کے کسی ادنیٰ کام کے مقابلہ میں موت کو زیادہ پسند کرتا ہو۔ ☆☆☆

File F:\Front.tif not found.

راز زندگی

خبر کی تحقیق کا فائدہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

"یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا إِن جَاءَ کُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَیَّنُوا أَن تُصِیْبُوا قَوْماً بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَی مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِیْنَ". [سورۃ الحجرات:٦]

ترجمہ: (اے وہ لوگو جو ایمان لائے! اگر کوئی گناہ گار آدمی تم کو کوئی خبر دے تو تم اس خبر کی تحقیق کرلو، ہوسکتا ہے کہ تم اپنی ناواقفیت کی وجہ سے کچھ لوگوں کو نقصان پہنچادو اور پھر بعد میں تمہیں نادم ہونا پڑے)۔

آداب معاشرت کی تعلیم دیتے ہوئے انسانی معاشرہ سے وابستہ ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ تم لوگ جو آپس میں باتیں کرتے ہو، اس میں احتیاط برتا کرو، معقول و متواضع انسان کی طرح رہو، کسی بھی معاملہ میں جلد بازی مت کرو، اگر تمہیں کوئی ایسی بات معلوم ہو جو قابل تنقید ہے تو فوراً اس بات کو عام نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ ان باتوں سے کوئی ایسی غلط فہمی پیدا ہو جائے جس سے نقصان ہو، کوئی شخص تمہارے پاس آکر کسی کے متعلق کوئی خبر دے، یا کوئی واقعہ سنائے، یہ بتائے کہ فلاں شخص آپ کے متعلق اس طرح کہہ رہا تھا، جب کہ بات بالکل خلاف واقعہ ہو، تو بغیر تحقیق کے یہ ممکن ہے کہ انسان اس کی بات سے متاثر ہوکر کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے جس سے نقصان پہنچ جائے، اور پھر بعد میں اپنی غلطی پر افسوس ہو، اسی لیے وضاحت کے ساتھ فرمادیا گیا کہ اگر کوئی گناہ گار آدمی جو صالح انسان نہیں ہے، کھلے طور پر گناہوں میں مبتلا ہے، جھوٹ بولتا ہے، ہر موقع پر غلط بات کہتا ہے، ذرا بھی احتیاط نہیں برتتا، ایسا آدمی جب تم کو کوئی خبر دے تو تم اس خبر کو نہ مانو، جب تک اس کی تحقیق نہ کرلو، تب تک اس کی کسی بات پر کوئی اقدامی عمل نہ کرو، تاکہ تحقیق کے بعد تمہیں کسی طرح کی شرمندگی محسوس نہ ہو۔

ہمارے معاشرہ میں اس قبیل کے بے شمار واقعات ہوتے رہتے ہیں، بے احتیاطی کے ساتھ سنائی گئی خبر پر عمل کرلیا جاتا ہے اور بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ خبر غلط تھی، جب کہ بعد میں اس کارروائی کو واپس نہیں لیا جاسکتا ہے جو ناواقفیت کی بنیاد پر ایک بے گناہ انسان کے ساتھ عمل میں آئی، آج کل لوگوں کا ایسا مزاج بن گیا ہے کہ وہ محض تفریح کے لیے اپنی مجلسوں میں دوسروں کا تذکرہ کرتے ہیں، اور بے خیالی میں اپنے تمام اچھے اعمال دوسرے شخص کو دے دیتے ہیں، دین اسلام میں اسی چیز کو "غیبت" کہا گیا ہے، غیبت کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کے عیب کو ذکر کیا جائے، غیبت کا مطلب یہ نہیں کہ کسی دوسرے پر الزام لگایا جائے، دوسرے پر الزام لگانے کو "اتہام" یعنی تہمت لگانا کہتے ہیں، شریعت میں ان دونوں چیزوں کی سخت ممانعت ہے، آج ہماری سوسائٹی میں غیبت کا مرض بالکل عام ہوگیا ہے، صرف تفریح کی خاطر اکثر لوگ اپنی نیکیاں دوسروں کو دے دیتے ہیں، یہ ایک خدائی نظام ہے کہ جس نے غیبت کی اس کی نیکیاں لے کر اس کو دے دی جائیں گی جس کی غیبت کی گئی، اگر اس شخص کی نیکیاں تھوڑی ہوں گی تو جس شخص کی غیبت کی گئی ہے اس کے گناہوں کو اس پر لاد دیا جائے گا، گویا ہم نے جو کام تفریح کے لیے کیا تھا اس کی سنگینی یہ ثابت ہوئی کہ ہماری آخرت برباد ہوگئی، ہم نے جو تھوڑی سی اتفاقی نیکیاں کی تھیں وہ بھی ختم ہوگئیں، اگر غور کیا جائے تو آج ہم سب اپنی نیکیوں کو اس طرح خود اپنے آپ بہا رہے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم آخرت میں چند اچھے اعمال کرنے کے باوجود بھی بالکل خالی ہاتھ ہوں گے، ہماری تمام نیکیاں دوسرے کو دی جاچکی ہوں گی۔

قرآن میں اسی قسم کے غیر محتاط لوگوں کی خبر پر یقین کرنے سے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا، تحقیق کا حکم دیا گیا، کیونکہ ایسے لوگ بسا اوقات کسی بھی بات میں مزید نمک مرچ لگا کر، بات کو بڑھاوا دے کر پیش کرتے ہیں، بے عیب بات کو عیب دار بنانے کی کوشش کرتے ہیں، جس سے انسان جذبات میں آجاتا ہے اور ناواقفیت کی بنیاد پر غلط اقدام کر بیٹھتا ہے، جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا اور انسان کو بعد میں افسوس ہوتا ہے۔

File F:\Front.tif not found.

عربی زبان کی مشہور کتاب ''کلیلہ دمنہ'' میں ایک واقعہ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو بغیر تحقیق کے کسی بھی بات پر فوراً اقدام نہیں کرنا چاہیے، ورنہ بسا اوقات انسان کو ایسی ندامت ہوتی ہے جس کا کوئی حل نہیں ہوتا، قصہ یوں ہے کہ ایک شخص نے اپنے گھر میں نیولا پالا، جو سانپوں کو کھا جاتا تھا، اس کی وجہ سے اس کے گھر میں سانپ نہیں آتے تھے، اور اس کا ایک چھوٹا بچہ سانپوں کے نہ آنے کی وجہ سے گھر میں محفوظ طریقہ پر کھیلتا تھا، ایک دن کی بات ہے کہ وہ شخص باہر کسی کام سے اپنے بچہ کو تنہا چھوڑ کر گیا، جب واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ نیولے کا منھ خون آلود ہے، جس سے اس شخص کو یہ شبہ ہوا کہ اس نے بچہ کو نوچا ہے اور اس کے ساتھ بدتمیزی کی ہے، اسی خیال میں اس نے نیولے کو مار ڈالا، اس کے بعد جب اندر گھر میں جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں ایک سانپ مرا ہوا پڑا تھا، جس کو اسی نیولے نے مارا تھا، اور اس کا منھ اسی کے خون سے خون آلود تھا، چنانچہ اس شخص کو اپنے اس عمل پر بہت ندامت ہوئی، لیکن ایسی ندامت کا کیا فائدہ جب کہ بغیر تحقیق کے اقدامی کارروائی ہو چکی تھی۔

اس طرح کے واقعات انسانی سماج میں بھی ہوتے رہتے ہیں، اس لیے اس سے سبق لینے کی ضرورت ہے کہ ہم کسی بھی غلط یا مبہم خبر پر ہرگز کوئی کارروائی نہ کریں، بلکہ خبر کی تحقیق کے بعد ہی کوئی قدم اٹھائیں۔

☆☆☆☆☆

ہماری مطبوعات

☆ عمدہ کاغذ ☆ بہترین طباعت ☆ خوبصورت سرورق

نمبر شمار	اسمائے کتب	قیمت
۱	زعیمان لحرکۃ الاصلاح	70/=
۲	روداد چمن	200/=
۳	الصحافۃ العربیۃ	160/=
۴	تمرین الصرف	55/=
۵	رسالۃ التوحید	60/=
۶	دیوان الحماسۃ (اول)	165/=
۷	دیوان الحماسۃ (دوم)	165/=
۸	فتاویٰ ندوۃ العلماء (اول)	350/=
۹	فتاویٰ ندوۃ العلماء (دوم)	400/=
۱۰	فتاویٰ ندوۃ العلماء (سوم)	400/=
۱۱	مختار الشعر العربی (اول)	15/=
۱۲	مختار الشعر العربی (دوم)	18/=
۱۳	العقیدۃ السنیۃ	20/=
۱۴	تاریخ الادب العربی (الاسلامی)	125/=
۱۵	تاریخ الادب العربی (الجاھلی)	70/=
۱۶	مقدمہ شیخ عبدالحق دہلویؒ	50/=
۱۷	اسلام کی تعلیم	16/=
۱۸	تفہیم المنطق	150/=
۱۹	مبادی علم اصول الفقہ	20/=
۲۰	سوانح صدر یار جنگؒ	200/=
۲۱	مختار من صفۃ الصفوۃ	150/=
۲۲	شرح العقیدۃ الطحاویۃ	55/=
۲۳	اصول الشاشی	60/=
۲۴	علم اصول الفقہ	100/=
۲۵	حیات عبدالباریؒ	150/=
۲۶	تاریخ ندوۃ العلماء (اول)	170/=
۲۷	تاریخ ندوۃ العلماء (دوم)	180/=

ملنے کے پتے:

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ	9889378176
مکتبۂ اسلام، امین آباد، گوئن روڈ، لکھنؤ	9415912042
مکتبہ الفرقان، نظیر آباد، لکھنو	9936635816
مکتبہ علمیہ، شباب مارکیٹ ندوہ روڈ، لکھنؤ	9198621671
مکتبہ طوبیٰ، ندوی منزل، ندوہ روڈ، لکھنؤ	9005505629

ایک ضروری اعلان: بعض ناشرین کتب نے مجلس صحافت ونشریات کی کتابیں غیر قانونی طور پر طبع کرالی ہیں، اس لیے قارئین سے گذارش ہے کہ مجلس کی جملہ درسی وغیر درسی کتابیں درج بالا مکتبوں ہی سے خریدیں اور بذریعۂ ڈاک بھی طلب کریں، مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ساتھ آپ کا یہ نہایت مخلصانہ تعاون ہوگا۔

ناشر:

مجلس صحافت ونشریات

ٹیگور مارگ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

File F:\Front.tif not found.

فکر معاصر

یورپ بیداری کے بعد

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

علمی تحریک کے جائزہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر پندرہویں صدی عیسوی تک مسلمان علم وفکر کے علم بردار رہے، یعنی سات صدیوں تک مسلمان علم وفن، فکر وادب اور تہذیب وتمدن کے میدان میں دنیائے انسانیت کی قیادت کرتے رہے، اس طویل عرصہ میں بڑے بڑے حکماء، فلاسفہ، علم وادب اور فکر وفن کے تمام تر میدانوں کے شہسوار و باکمال پیدا ہوئے، ان میں اہل تدبیر و حکومت بھی ہیں اور قائدین و حکمراں بھی، اسلامی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کی مدد سے یورپ میں جو بیداری آئی اس کا آغاز سولہویں صدی عیسوی میں ہوا اور اٹھارویں صدی عیسوی میں وہ اپنے اوج کمال کو پہنچ گئی۔

اٹھارویں صدی عیسوی کو روشن دور (Age of Enlightenment) کہا جاتا ہے، یہی وہ زمانہ ہے جس میں یورپی مفکرین نے مذہب وکلیسا اور قدیم روایات سے ہٹ کر اپنے علم وتجربات، آزاد مطالعہ اور عقل محض کی روشنی میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کا جائزہ لیا، اس تنقیدی مطالعہ کے نتیجہ میں تمام سابقہ معروف ومقبول افکار ونظریات، مذہبی اقدار وروایات اور کلیسا کو تلخ تنقید بلکہ تخریبی تنقیدوں کا سامنا کرنا پڑا، مفکرین ماضی کی ہر چیز کو ختم کرنے کے درپہ ہوگئے، اور قدیم اصول و مبادی اور مسلمات کو شک کی نگاہ سے دیکھا، اس رویہ نے انسانی زندگی اور اس کی بنیادوں کو بڑا نقصان پہنچایا، نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کے فکر ونظر میں ایک بھونچال آگیا، لیکن کئی پہلوؤں سے یہ انقلاب سودمند بھی ثابت ہوا۔

ایک طرف وولٹیر Voltaire نے نمائندہ حکومت کا تصور پیش کیا، تو دوسری طرف جان جاک روسو Jean Jacques Rousseau نے آزادئ تعلیم اور جمہوریت کا تصور پیش کیا، ان دونوں نے یورپی سوسائٹی میں ایک ایسے فکری انقلاب کو جنم دیا جو شورش و بغاوت کا سبب بن گیا، سب سے پہلے فرانس میں یہ انقلاب رونما ہوا جس نے پورے یورپ کو متاثر کیا، حالانکہ اس سے قبل انگلینڈ میں جمہوری حقوق کی بازیابی کی کوششیں ہو چکی تھیں، چنانچہ ۱۶۸۸ء میں برطانیہ میں انقلاب آیا اور تقلیدی نظام Classical Regime میں بعض اصلاحات عمل میں آئیں، لیکن ۱۷۸۹ء میں ہونے والا فرانسیسی انقلاب ایک طاقتور اور عظیم انقلاب ثابت ہوا، اس انقلاب میں بڑا خون خرابہ ہوا اور اخیر میں متوسط درجہ کے لوگ حکومت پر قابض ہوگئے، پھر دیگر یورپی ممالک میں واقعات وحوادث رونما ہوئے، اس انقلاب نے فرد کی آزادی کی صدا بلند کی اور فرد کی خواہش و رغبت کو ہر نظام کی اصل قرار دیا، خواہ وہ سیاست و معیشت سے متعلق ہو یا تعلیم وسماج سے، یا پھر اخلاق وتربیت سے، اس انقلاب نے مالیاتی نظام میں سرمایہ دارانہ نظام، سیاست میں پارلیمنٹری نظام اور دین واخلاق کو ہر نظام سے الگ تھلگ رکھنے کے نظریہ کو فروغ دیا۔

۱۷۸۹ء کے انقلاب کے بعد فرانس میں متعدد حکومتوں کا قیام عمل میں آیا اور ۱۷۹۲ء تک کئی بار سیاسی اتار چڑھاؤ سے اس کو گذرنا پڑا، اس کے بعد زمام حکومت ان لوگوں کے ہاتھ آئی جو مہم جو اور جانباز قسم کے لوگ تھے، ان جانبازوں کا مطمح نظر نئے علاقوں پر یلغار اور ان کی تسخیر تھا، ان بلند ہمت حکمرانوں میں نپولین کا نام سرفہرست ہے جو یورپ کے بعض ممالک سے لڑتا ہوا ۱۷۹۷ء میں مصر میں داخل ہوا، ادھر انگلینڈ میں جمہوری حقوق کی خاطر کئی بغاوتیں ہوئیں اور ۱۸۴۸ء میں دنیائے یورپ کے مختلف ممالک میں بغاوتوں کی فضا عام ہوگئی، مجبوراً یہ ممالک سیاسی اور اقتصادی نظام میں اصلاحات کرنے پر رضامند ہوگئے، اصول عامہ میں بھی تبدیلی آئی، جن میں سرفہرست وہ نظام تعلیم تھا جس نے آزادئ فرد کی تحریک سے خاصا اثر قبول کیا تھا، زندگی کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے کے لیے اہل علم نے علم کا راستہ اختیار کیا اور نئے آفاق وگوشے تلاش کیے اور ان علمی وتحقیقی موشگافیوں وسرگرمیوں کے سبب یورپ برق رفتار ذرائع آمد و رفت کو حاصل کرنے اور لوہے کی صنعت کو ترقی دینے کے قابل ہوگیا، اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے تمام میدانوں میں پسماندہ ممالک پر اس علمی ترقی کے ذریعہ قبضہ کرلیا۔

File F:\Front.tif not found.

عالم اسلام پر قبضہ کا تخیل

۱۵ / مارچ ۱۶۷۲ء کو ایک جرمن مفکر لیبنیز Leibniz (۱۶۴۶.۱۷۱۶ء) نے لوئیس چودہویں LouisXIV کو ایک خط لکھا جس میں اس نے لوئیس چودہویں کو جرمنی کے بجائے مصر پر حملہ کے فوائد سمجھائے ، اس خط میں تحریر ہے:

''میں آپ کی توجہ ایک پلان کی طرف متوجہ کرانا چاہتا ہوں، یہ مصر پر حملہ اور قبضہ کا پلان ہے مصر کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جس پر قبضہ کرنے سے پورے عالم پر قبضہ کیا جاسکتا ہو، اور ساری دنیا کی تجارت اپنے قبضہ میں آسکتی ہو، یہ کثیر آبادی اور زرخیز زمین والا ملک ہے، جس کی مثال ملنا مشکل ہے، یہ قدیم زمانہ میں علم وتمدن کا مرکز رہا ہے، اور خدا کی نعمتوں کا حامل، لیکن اب یہ مسلمانوں کے قبضہ میں ہے، جو ہمارے دشمن ہیں، یہ کیوں مسیحیت سے محروم رہے، یہ ایشیا اور افریقہ کے درمیان پل کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے ذریعہ ہم ایشیا اور افریقہ پر قبضہ کرسکتے ہیں، یہ بحر احمر Red Sea اور بحر ابیض Mediterranean کے درمیان حائل ہے، پورے مشرق تک پہونچنے کا راستہ ہے، آپ کے لیے مصر پر قبضہ آسان ہے۔ قسطنطنیہ پر ترکوں کا قبضہ ہے، لیکن اگر مصر پر ہنگامی حملہ کیا جائے تو خلافت عثمانیہ کے لیے اس کی مدد کرنا مشکل ہے، اس کے علاوہ مصر وسیع ریگستانی علاقوں سے گھرا ہوا ہے'' ۔[معالم التاریخ الاسلامی المعاصر، ص:۴۲، انورالجندی]

عالم اسلام میں مغربی استعمار کا آغاز سترھویں صدی میں ہوا، حالانکہ مغربی ہندوستان کے ساحلی علاقے سولہویں صدی عیسوی میں پرتگالیوں کے قبضہ میں آگئے تھے۔

ہالینڈ کے باشندے تاجروں کی حیثیت سے انڈونیشیا پہنچے، کچھ مدت گذرتے ہی سترھویں صدی عیسوی میں انہوں نے انڈونیشیائی باشندوں پر زیادتیاں کی اور انکو اپنا غلام بنالیا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں انگریزوں نے مختلف ذرائع اختیار کر کے ہندوستان کے بعض علاقوں کو اپنے قبضہ میں لیا اور ۱۸۵۷ء میں پورا ہندوستان انگریزوں کے ہاتھوں میں چلا گیا اور مغلوں کی حکومت زوال کا شکار ہوگئی۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں روس نے عثمانی حکومت کے زیر اقتدار جزیرہ نمائے خرم پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد سائبریا پر قبضہ کر لیا ، انیسویں صدی عیسوی میں برطانیہ نے جنوبی جزیرۂ عرب اور اسکے مشرقی ساحل پر اور اس کے بعد مصر وسوڈان پر اپنا تسلط جمالیا، اسی صدی میں فرانسیسیوں نے شمالی افریقہ اور اسکے بعض درمیانی خطوں پر قبضہ کرلیا، بیسویں صدی میں روس نے عثمانی خلافت کے زیر اثر مسلم ریاستوں (آذربائجان، ترکمانستان، ازبکستان قیرغستان ، قزاقستان ، داغستان) پر قبضہ کیا ، ۱۸۳۲ء میں فرانس الجزائر پر قابض ہوا ، اس کے بعد شام اور لبنان پر بھی فرانسیسیوں کا قبضہ ہو گیا اور پھر لیبیا بھی بیسویں صدی کے آغاز میں اٹلی کے قبضہ میں آگیا ، اور اخیر میں آستانہ میں عثمانی سلطنت نے دم توڑ دیا۔

ہندوستان میں انگریزوں کے اثر ورسوخ کی ابتدا سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہوئی، شکل یہ بنی کہ بعض تاجر اور ڈاکٹروں نے ہندوستان کا رخ کیا، مغل قصر حکومت سے انہوں نے تعلقات قائم کیے ،اور بعض حکمرانوں کا بھروسہ حاصل کرلیا ، اس اثر ورسوخ نے اس وقت اور وسعت اختیار کر لی جب ۱۶۰۰ء میں لندن میں قائم ہوئی ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندہ کی حیثیت سے جون میلڈنہال John Mildenhall آگرہ پہنچا اور ۱۶۰۸ء میں بعض تجارتی مراعات حاصل کرلیں ، یہ سہولتیں اور بڑھیں جس کے نتیجہ میں تاجران برطانیہ سے ٹیکس اور درآمدات پر لئے جانے والے محصول کو ختم کر دیا گیا ،تجارتی ، سائنسی ، اور تعلیمی سرگرمیوں کو انجام دینے کے لیے کچھ مقامات ان کے لیے مخصوص کر دیے گئے ، بنگال میں ان کا اقتدار بڑھا اور جنوبی ہندوستان میں ایک شہر بسانے کے معاہدہ کو آخری شکل دے دی گئی ، بہار و بنگال میں انہوں نے اپنی کچھ کالونیاں قائم کیں، اور ۱۷۵۷ء میں میر جعفر کی غداری کے بعد بنگال کے علاقوں پر ان کا قبضہ ہو گیا، اس سے پہلے ۱۶۸۸ء میں انگریزوں نے بنگال پر غلبہ حاصل کرنے کیلئے ایک سازش رچی تھی ، لیکن اس میں وہ ناکام ثابت ہوئے ، ہندوستان کے مختلف علاقوں میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی بنیاد ڈال کر انگریزوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد انگریزوں نے حکمرانوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکایا ، آپس میں لڑایا اور پھر کس مپرسی کی انتہائی حالت سے گذر رہے پایۂ تخت سے ان علاقوں کو الگ کر دینے کے لیے بغاوتیں کرائیں۔

ہندوستان کی خارجی تجارت پر انگریزوں کا

مکمل قبضہ ۱۷۵۹ء میں ہوا اورڈچ کے پسپا ہونے کے بعد پانڈیچری Pondichery بھی ان کے قبضہ میں آگیا۔

رابرٹ کلائیو Robert Clive اور واٹسن Wotsin نے انگریزی افواج کو جمع کیا اور جب وارن ہاسٹنگ Worren Hastings (۱۷۳۲ء-۱۸۱۸ء) حاکم بنگال کی حیثیت سے ہندوستان آیا تو اس نے تعلیمی اور عدالتی نظام اور معیشت کے نظام میں بعض اصلاحات کیں ، اور ۱۷۸۱ء میں کلکتہ مدرسہ Calcutta Madrasa کی بنیاد رکھی ،۱۷۹۲ء میں ٹیپو سلطان (متوفی ۱۷۹۹ء) کی فوجوں کو شکست دے کر جنوبی ہندوستان پر بھی قبضہ کرلیا۔

۱۷۹۳ء میں انگریزوں نے کچھ انتظامی اصلاحات نافذ کیں اور اپنے غلبہ وتسلط کو مضبوط کیا ،شرعی عدالتوں کو برطانوی عدالتوں میں تبدیل کیا، ہندوستانیوں پر پابندیاں عائد کیں، اعلی عہدوں پر ان کے داخلہ کو ممنوع قرار دیا، انگریزی زبان کے سرکاری زبان ہونے کا فرمان جاری کیا اور ۱۸۳۷ء میں فارسی زبان پر عمل کو ختم کردیا۔

۱۸۵۶ء میں اودھ Avadh پر بھی گوروں کا قبضہ ہوگیا، ۱۸۵۷ء میں پایۂ تخت دہلی ان کے قبضہ میں آگیا اور ۱۸۵۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہوئی اور اسکی جگہ وائسرائے Viceroy کا نظام قائم ہوا، اور پورا ہندوستان برطانوی سامراج کے قبضہ میں آگیا۔

[ترجمانی: حیدرا غوانی ندوی]

☆☆☆☆☆

حقوق اللہ میں دخل اندازی مناسب نہیں

مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری

عن جندب أن رسول الله صلى الله عليه وسلم حدّث أن رجلاً قال: والله لا يغفرن الله لفلان وإن الله قال: من ذا الذى يتألى على أن لا اغفر لفلان ، فإنى قد غفرت لفلان وأحبطت عملك ، أو كما قال .[حدیث:۲۸۹،السلسلة الصحيحة]

ترجمہ: حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک آدمی نے کہا: اللہ کی قسم! اللہ فلاں شخص کو نہیں بخشے گا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ کون کہتا ہے؟ یہ کون ہوتا ہے جو میرے بارے میں بات کرتا ہے کہ میں فلاں شخص کو نہیں بخشوں گا؟ میں نے فلاں کو بخش دیا، اور اس شخص کے عمل کو ضائع کردیا۔

یہ حدیث ہماری سماجی زندگی کے اس خدوخال کو ظاہر کرتی ہے، جس میں ہم ایک دوسرے سے باہمی ربط کی بنیاد پر ملتے جلتے ہیں، معاملہ کرتے ہیں، خوشی ومسرت کے موقع پر ایک دوسرے کی خوشیوں کو دوبالا کرتے ہیں، اور کبھی کسی بات پر ناراض ہوتے ہیں تو لعن طعن بھی کرنے سے باز نہیں آتے ، بلکہ انتہا یہ ہوتی ہے کہ اس کے دین وعقیدہ کی نفی کرتے ہوئے برملا اسے جہنمی بھی گردانے لگتے ہیں، یہی نہیں بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی اسے ایسا ہی سمجھیں، ایسے لوگوں کے لیے یہ حدیث تنبیہ کرتی ہے کہ یہ خدائی حقوق میں مداخلت کے مترادف ہے، تمہیں کیا حق پہونچتا ہے کہ صراحت کے ساتھ کسی کی بخشش کی بھی نفی کردو، آج ہمارے معاشرہ میں یہ بیماری عام ہے۔

حدیث شریف میں یہ بھی آیا ہے کہ جو کسی کو کافر کہتا ہے، اور وہ بظاہر مسلمان کلمہ گو ہے، تو یہ کلمۂ کفر خود اسی پر لوٹ آتا ہے، یعنی خود وہ اس قول کی زد میں آکر اپنی دینی، ایمانی، روحانی زندگی کو پامال کرنے والا بن جاتا ہے، لہٰذا بہت ڈرتے رہنا چاہیے، سمجھا اپنا کام ہے، جنت ودوزخ کا فیصلہ یہ خالق کون ومکاں کی ذمہ داری ہے۔ دراصل اس بات کا اس حدیث میں اشارہ موجود ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے دائرۂ اختیار میں دخل اندازی نہ دے، Interpass نہ کرے، یہ اختیار اللہ تعالیٰ کو ہے، اس کے حکم کی دو قسمیں ہیں، بندوں کے تعلق سے تقاضائے فطرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کچھ کرنے کا حکم دیا ہے اور کچھ باتوں سے روکا ہے، اور بعض باتوں میں بندے کو اختیار دیا ہے، اگر نماز کا حکم دیا گیا ہے، فرائض کی ادائیگی لازم کی گئی ہے تو منہیات سے اجتناب کو ضروری قرار دیا گیا، لہٰذا اس میں تو بندے کو اختیار نہیں کہ اس کو طاقت کے بل بوتے پر بدلوادے، یا اس کے برعکس کوئی دوسرا حکم لائے، البتہ اختیاری چیزوں میں بندے کو یہ موقع حاصل ہے کہ کرے تو بہتر ہے، نہ کرنے پر مؤاخذہ نہیں ہے۔

آج بہت سے اختیاری شرعی امور میں بھی تخریبی شناخت کی بنیاد پر ایک دوسرے کو لعن طعن کرنے سے گریز نہیں کیا جاتا ہے، اور کبھی کبھی تکفیر تک بات پہونچ جاتی ہے۔

شریعت نے ہر حال میں انابت کی تلقین کی ہے، ہر حال میں اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے، اور اپنی مغفرت کے ساتھ ساتھ دوسروں کی مغفرت کی دعا بھی کرنی چاہیے۔

☆☆☆

File F:\Front.tif not found.

حب صادق

اہل بیت اور اصحابِ رسولؐ

● .....مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

فتح بیت المقدس کے موقع سے عیسائیوں نے مطالبہ کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود بیت المقدس آئیں اور اپنے ہاتھ سے صلح نامہ تحریر کریں، اس پس منظر میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے وہاں آنے کی درخواست کی، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مشورہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود نہ جائیں، تاکہ رومیوں کی ناک نیچی ہو، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ یہ ایک تاریخی شرف کی بات ہے اور اس طرح مسلمانوں کو جنگ سے بچایا جاسکتا ہے، اس لیے امیر المومنین کو سفر کرنا چاہیے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ رضی اللہ عنہ کی رائے کو پسند فرمایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اپنا نائب بنا کر تشریف لے گئے اور اس طرح بیت المقدس فتح ہوا۔

دوسری طرف خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں اہل بیت کی بڑی عظمت ومحبت تھی، ایک بار یمن سے کپڑے آئے، جن کو عرب ''حلہ'' کہتے تھے، آپ نے سب کو تقسیم کیا، لوگ نئے نئے لباس پہن کر مسجد نبویؐ میں آئے، وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملتے اور ان کا شکریہ ادا کرتے، اتنے میں حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما مکان سے نکلے، ان کے جسم پر حلہ نہیں تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اداس بیٹھے ہوئے تھے، لوگ اس اداسی کا سبب پوچھنے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ان دونوں بچوں کو حلہ نہیں مل سکا، کیونکہ یہ حلے ان کی قد سے بڑے تھے، پھر آپؓ نے یمن کے گورنر کو خط لکھا، حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کے لیے جلد سے جلد دو حلے بھیجے جائیں، جب یہ حلے آئے اور آپؓ نے انہیں پہنایا، تب جا کر آپ کو اطمینان ہوا۔[الاصابۃ: ج۱/ص۱۰۶]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب مالی فراوانی ہوئی تو آپؓ نے لوگوں کے لیے وظیفہ مقرر کرنا چاہا، اور ترتیب کیا ہو، اس کے لیے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: امیر المومنین آپ اپنے آپ سے شروع کیجیے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں، میں اس شخص سے شروع کروں گا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قریبی رشتہ دار ہوگا، ان کے بعد بنو ہاشم کے دوسرے لوگوں کا حصہ مقرر کروں گا، چنانچہ سب سے پہلے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا اور ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حصہ مقرر کیا، حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما حالانکہ اس وقت بچے تھے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کی وجہ سے ان کا بھی حصہ مقرر فرمایا، [کتاب الخراج لابی یوسف، ص:۲۴] اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کی وجہ سے بدری صحابہؓ کے برابر وظیفہ مقرر کیا۔[المرتضیٰ، ص:۱۱۰]

حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سے مروی ہے کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خواہش کی کہ وہ ان کے پاس آیا کریں، میں ایک دن گیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ خلوت میں تھے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے داخل ہونا چاہتے تھے، مگر ان کو اجازت نہیں ملی، اس لیے میں واپس آگیا، پھر ملاقات کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنے کے بارے میں یاد دلایا، تو حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس موقع کا ذکر کیا اور کہا کہ جب میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ انہیں واپس ہونا پڑا تو میں بھی واپس ہوگیا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ: تم عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ اجازت کے مستحق تھے، پھر اپنے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ اس میں ایمان کا جو پودا لگا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اور پھر تم لوگوں یعنی خانوادۂ نبوت کے ذریعہ ہے۔[الاصابۃ: ج۱/ص۱۳۵]

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خانوادۂ نبویؐ سے ایسی عقیدت تھی کہ آپؓ نے عمر کے تفاوت کے باوجود حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح کی خواہش کی اور فرمایا کہ: یہ رشتہ میں صرف خانوادۂ نبوت سے نسبت کے لیے چاہتا ہوں، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: تمام خاندانی نسبتیں قیامت میں منقطع ہوجائیں گی سوائے میری نسبت کے، اسی لیے میں اس رشتہ کا متمنی ہوں، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی اس خواہش کو قبول کرتے ہوئے اپنی صاحبزادی کو ان کے نکاح میں دے دیا اور ان ہی سے زید بن عمر بن خطاب پیدا ہوئے، جو فخر کرتے تھے کہ میں دو خلفاء کی اولاد میں ہوں، ایک حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرت علی رضی اللہ عنہ۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اکثر فیصلے

File F:\Front.tif not found.

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشورے پر ہوتے تھے، عراق کی مفتوحہ زمین مجاہدین میں تقسیم کی جائیں یا بیت المال کی ملکیت ہو، اس سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے تھی کہ بیت المال کی ملکیت ہو اور اسی پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فیصلہ کیا، اسلامی کیلنڈر کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے تھی کہ اس کا نقطۂ آغاز واقعہ ہجرت کو بنایا جائے اور اسی پر فیصلہ ہوا، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بعض مواقع پر فرمایا کہ اگر علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نہ ہوتے تو عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہلاک ہوجاتا: "لولا علی لهلك عمر"۔[الاستیعاب]

جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات ہوئی اور ان کی لاش کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی، تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے، چہرے سے کپڑا ہٹایا اور فرمایا: اے ابوحفص! آپ پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے علاوہ کوئی ایسا شخص نہیں کہ جس کے نامۂ اعمال کے ساتھ مجھے اللہ تعالیٰ کے یہاں جانا پسند ہو: "فو الله ما بقي بعد رسول الله ﷺ أحد أحب إلي أن ألقى الله بصحيفته منك"۔[مسند احمد]

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ زار وقطار رو رہے تھے، جب ان کے گریہ وزاری کو دیکھ کر لوگوں نے سوال کیا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہ بات کہی، جو ان کی دور رس نظر کی دلیل اور گہری بصیرت کی آئینہ دار ہے، آپؓ نے فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موت سے ایسا خلا پیدا ہوا ہے جو قیامت تک پُر نہ ہوسکے گا۔ [دیکھئے: المرتضیٰ: ص ۱۴۴] غرض کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان گہری محبت اور باہمی ہمدردی کا تعلق تھا، وہ ایک دوسرے کے خیر خواہ اور قدر شناس تھے، ان کے دلوں میں نہ کوئی کینہ تھا، نہ کدورت، وہ "اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ" اور "رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" کے بہترین مصداق تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں کے درمیان دوسری خاندانی نسبتوں سے تو قرابت تھی ہی، ساتھ ہی ساتھ دونوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دامادی کا شرف بھی حاصل تھا، گویا ان حضرات کی حیثیت ایک گھر کے دو افراد کی سی تھی، اسی لیے دونوں میں بڑی محبت اور ایک دوسرے کا پاس ولحاظ تھا، جب فتنہ پرداز سبائیوں نے خلیفۂ مظلوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تو مہاجرینؓ و انصارؓ کی بڑی جماعت جن کی تعداد سات سو کے قریب تھی، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تحفظ کے لیے ان کے گھر میں فروکش ہوگئی، ان میں حضرت حسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی تھے، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بہت اصرار کے ساتھ اپنی مدد کو آئے ہوئے لوگوں سے کہا کہ وہ اپنے اپنے گھر چلے جائیں، یہاں تک کہ اپنے غلاموں سے فرمایا کہ: جو اپنی تلوار نیام میں رکھ لے، وہ آزاد ہے، بالآخر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بار بار کے اصرار پر یہ حضرات وہاں سے واپس ہوئے، لیکن سب سے آخر میں جس نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کو چھوڑا، وہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما تھے۔[البدایہ والنہایۃ لابن کثیر: ج ۷/ص ۱۸۱]

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے دوبار اجازت طلب کی کہ وہ ان کے دفاع کے لیے جنگ کریں، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر عرض کیا کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اس پر حق ہے اور جس کو اقرار ہو کہ اس پر میرا کوئی حق ہے تو میری خاطر پچھنہ لگانے کے بہ قدر خون نہ بہائے، جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دو دو بار اجازت طلب کرنے کے باوجود حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو قبول نہیں کیا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز پڑھنے چلے گئے، باغیوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے گزارش کی کہ آپ نماز پڑھائیں، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں تم لوگوں کو اس حال میں نماز نہیں پڑھا سکتا کہ امام المسلمین محصور ہو، بلکہ میں نماز تنہا پڑھوں گا، چنانچہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تنہا نماز ادا فرمائی اور گھر واپس ہوگئے۔[المرتضیٰ، ص: ۱۳۴]

جب محاصرہ سخت ہوگیا، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پانی ختم ہوگیا اور آپؓ نے مسلمانوں سے فریاد کی تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ باغیوں کے علی الرغم ایک مشکیزہ پانی لے کر بمشقت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچے اور انہیں پانی مہیا کیا، حالانکہ باغیوں نے انہیں سخت سست بھی کہا اور ان کی سواری کو بھگا دیا۔ [البدایۃ والنہایۃ، ج ۷/ص ۱۸۷)

اہل بیت اور دوسرے صحابہؓ کے درمیان خوشگوار تعلق کا ایک پہلو یہ ہے کہ ان کے درمیان آپس میں کثرت سے رشتہ داریاں تھیں، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں یکے بعد دیگرے دو صاحبزادیاں رہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پوتی کا نکاح حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بعض کے روایات کے مطابق حضرت حسین رضی

اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوا، اہل بیت کی ایک اہم ترین شخصیت امام محمد باقر کا نکاح حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے قاسم ابن محمد کی صاحبزادی ام فروہ سے ہوا، اسی سے امام جعفر صادق جیسے فقیہ اور صاحب علم پیدا ہوئے، جن سے امام ابوحنیفہ اور اکثر فقہاء اہل سنت کو تلمذ رہا ہے، امام جعفر صادق کی والدہ ام فروہ ہیں، جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے قاسم کی صاحبزادی ہیں اور ان کی نانی اسماء بنت عبدالرحمٰن ہیں، جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پوتی ہیں، اس لیے امام جعفر صادق کہتے ہیں: "ولدنی ابو بکر مرتین" یعنی میں دو جہت سے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں گزر چکا ہے کہ حضرت ام کلثوم بنت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ان کا نکاح ہوا، جن سے زید بن عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ پیدا ہوئے، وہ اس بات پر ناز کرتے تھے کہ میں دو خلفاء راشدین کا بیٹا ہوں، یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیٹا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نواسہ، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آل کے ساتھ آل علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شادی بیاہ کے رشتے کثرت سے ہوئے ہیں، کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں بھی بنوامیہ اور بنوہاشم کے درمیان کثرت سے رشتہ داری تھی، اس سلسلہ میں "آل البیت والصحابہ- صحبة وقرابة" (جس کا ترجمہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ سے شروع ہو چکا ہے) میں اس پہلو پر چارٹ کے ساتھ بڑی تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے، خاص کر یہ بات بہت اہم ہے کہ حضرت حسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی جو نسلیں معروف ہیں، وہ زیادہ تر حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پوتیوں، نواسیوں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد سے ہوئی ہیں۔

انسان کو جس سے محبت ہوتی ہے، اس کے نام پر لوگ اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں، اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو اہل بیت کے حسنی اور حسینی خانوادہ میں کثرت سے حضرت ابوبکر، حضرت عثمان اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نام ملتے ہیں، خود حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک صاحبزادے کا نام ابوبکر تھا، جو میدان کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ شہید ہوئے تھے، حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ایک صاحبزادے کا نام بھی ابوبکر تھا، جنہوں نے کربلا میں اپنے چچا حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ شہادت پائی، حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک صاحبزادے علی زین العابدین ہیں، جن سے آپ کی نسل مبارک چلی، ان کی بھی کنیت ابوبکر تھی، امام جعفر صادق کے پوتے امام علی رضا کے ایک صاحبزادے کا نام بھی ابوبکر تھا، حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے بھی ابوبکر سے موسوم تھے، جنہوں نے کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ جامِ شہادت نوش فرمایا۔

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک صاحبزادے "عمر الاطرف" تھے، جن کی والدہ کا نام تھا "ام حبیب صہباء التغلبی"، حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک صاحبزادے کا نام عمر تھا جو کربلا میں شہید ہوئے، حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے حضرت علی زین العابدین کے ایک صاحبزادے کا نام تھا "عمر الأشرف"، امام موسیٰ کاظم کے بھی ایک صاحبزادے عمر نام کے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادوں میں ایک کا نام عثمان بھی تھا جو حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ شہید ہوئے، حضرت عقیل بن ابی طالب کے بھی ایک صاحبزادے کا نام عثمان تھا، اسی طرح اہل بیت اطہار میں بہت سی خواتین عائشہ نام کی ملتی ہیں، جیسے امام موسیٰ کاظم کی صاحبزادی کا نام عائشہ تھا، موسیٰ کاظم کے صاحبزادے جعفر کی بھی ایک بیٹی عائشہ تھیں، علی رضا کی ایک صاحبزادی بھی عائشہ تھیں، علی رضا کے پوتے علی ہادی کی صاحبزادی کا نام بھی عائشہ تھا، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے سید ابراہیم بن احمد الکتانی کو کہ انہوں نے "الاسماء والمصاهرات بين أهل البيت والصحابة" کے نام سے اس موضوع پر ایک بڑا عمدہ اور چشم کشا رسالہ مرتب کیا ہے، جس کا اردو ترجمہ معروف محقق مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی کے زیر اہتمام طبع ہو چکا ہے۔

ظاہر ہے کہ انسان ایسے افراد کے نام پر اپنے بچوں کے نام نہیں رکھتا جن کی شخصیتیں اس کو محبوب نہ ہوں، یا جن سے اسے نفرت ہو، لہٰذا ان باہمی رشتہ داریوں اور ایک دوسرے کے نام پر اپنی اولاد کے نام رکھنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے درمیان بے حد محبت وخلوص کا تعلق تھا، وہ ایک دوسرے کی عزت کرنے والے اور ایک دوسرے سے محبت رکھنے والے تھے، دنیا میں بھی ان کے قلوب کینہ وکدورت سے خالی تھے اور آخرت میں بدرجہ اولیٰ رہیں گے، ہمارا بھی رویہ یہی ہونا چاہیے کہ اہل بیت اطہار، ازواج مطہرات اور تمام صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے محبت کریں اور اپنے دل ان کی طرف سے صاف رکھیں: "رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا" ۔[سورۃ الحشر:۱۰]

☆☆☆☆☆

File F:\Front.tif not found.

فکرونظر

بچوں کی تربیت کے کچھ رہنما اصول

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی

اکثر والدین کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ان کی اولاد ان کا کہنا نہیں مانتی جس کی وجہ سے وہ نفسیاتی الجھن کا شکار او رذہنی کوفت میں مبتلا رہتے ہیں، حالانکہ اس مسئلہ کا حل اتنا مشکل نہیں جتنا کہ وہ سمجھتے ہیں، درج ذیل مضمون میں کچھ اسی قسم کی مثالیں پیش کی جارہی ہیں جو اولاد کے اندر اطاعت وفرماں برداری کا جذبہ پیدا کرنے میں مفید ہوسکتی ہیں۔

پہلی مثال

خلیل دس سال کا ایک لڑکا ہے، جو اپنے دوست کے گھر جانے کے لیے اپنی والدہ سے اجازت مانگ رہا ہے، والدہ سے اجازت ملنے کے بعد وہ اپنے دوست سے ملنے کے لیے اس کے گھر روانہ ہوجاتا ہے، لیکن بجائے اس کے وہ پانچ بجے لوٹے جیسا کہ اس نے اپنی والدہ سے وعدہ کیا تھا وہ چھ بجے لوٹتا ہے، اب اس کی والدہ کو اس کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے؟ او راس کی تاخیر پر اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟ اس کے دو طریقے ہیں:

۱- اس کے آتے ہی اپنی خفگی کا اظہار کرے وعدہ خلافی پر اس کی سرزنش کرے اور یہ کہے کہ وعدہ خلافی تو تمہاری عادت ہے تم نے کبھی وقت کی پابندی نہیں کی اب تم لیٹ آکر دیکھو۔

۲- خاموشی اختیار کرے او راس کو اس بات کا احساس بھی نہ ہونے دے کہ اس نے کوئی غلطی کی ہے، اس کو موقع دے کہ وہ لباس وغیرہ تبدیل کرلے، تھکا ہوا ہو تو ستالے، بھوکا ہو تو کھانا کھالے، کوئی ضرورت ہو تو اس سے بھی فارغ ہوجائے اور سکون واطمینان کے ساتھ رات گزارے، اگلے دن جب وہ دوبارہ اپنے کسی دوست سے ملنے کے لیے والدہ سے اجازت طلب کرے تو ماں یہ کہتے ہوئے اس کو جانے سے روک دے کہ چونکہ تم وعدہ پورا نہیں کرپاتے ہو لہٰذا آج میں تم کو جانے کی اجازت نہیں دوں گی۔

سمجھانے کا یہ سنجیدہ طریقہ پہلے طریقہ سے کہیں بہتر ہے، جس میں چیخ وپکار مچتی ہے نہ ماں کی ذہنی کوفت گھٹنے کے بجائے اور بڑھتی ہے، لڑکے کی اندر محاذ آرائی اور ہٹ دھرمی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور ماں کے اس طرز عمل میں لڑکے کو ایک ماں کا نہیں اجنبی عورت کا عکس نظر آتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنی ماں سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

دوسری مثال

ایک لڑکا ہے، رشید اس کا نام ہے، عمر لگ بھگ دس سال ہے، ایک بلی اسے پسند ہے، جس کو وہ پالنا چاہتا ہے، والدہ کو اس کا بلی پالنا پسند نہیں، لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی کہ ایکدم سے انکار کرکے بچہ کی خواہش کا گلا گھونٹ دے، چنانچہ سنجیدگی کے ساتھ وہ اس مسئلہ کا حل تلاش کرتی ہے، اور اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ بچہ کی یہ خواہش وقتی ہے، جو چند ہی دنوں میں اس کے دل سے نکل جائے گی، اور جلد ہی نوبت یہاں تک آجائے گی کہ بچہ بلی کی طرف سے لاپرواہی برتنے لگے گا، اور بالآخر وہ بلی اس کی لاپرواہی کا شکار ہوجائے گی، اور اس طرح بلی سے چھٹکارا مل جائے گا، چنانچہ ماں نے بچہ کی بات مان لی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے ایک شرط یہ بھی لگادی کہ بلی کی دیکھ بھال تنہا تمہارے ذمہ ہوگی، اور میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، اگر تم بلی کی دیکھ بھال میں کوتاہی کروگے، تو اس کا نقصان بھی تنہا تم کو اٹھانا ہوگا، رشید والدہ کی یہ شرط تسلیم کرلیتا ہے، شروع میں تو وہ بلی کا بڑا خیال رکھتا ہے، اور اس کی دیکھ بھال میں بڑی سرگرمی دکھاتا ہے، لیکن آہستہ آہستہ بلی سے اس کا تعلق کم ہونے لگتا ہے، اور بعض وقت تو وہ بلی کو کھانا اور پانی تک دینا بھول جاتا ہے، چنانچہ ایک وقت وہ آتا ہے کہ بھوک اور پیاس سے وہ بلی جان دے دیتی ہے، ماں کو جب بلی کی موت کا علم ہوتا ہے تو فوراً آگ بگولا نہیں ہوتی اور نہ ہی رشید کی لاپرواہی پر اس کو ملامت کرتی ہے، اور نہ ہی اس کو ظالم اور قاتل جیسے خطابات سے نوازتی ہے، بلکہ نہایت سکون واطمینان کے ساتھ اس سے کہتی ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا کہ تم بلی کی دیکھ بھال کروگے اور اس کو کسی بھی طرح کی تکلیف نہ ہونے دوگے، اس معاہدہ کو پورا کرنے میں تم ناکام رہے جس کی وجہ سے ایک بلی کی جان گئی، لہٰذا

File F:\Front.tif not found.

اب آئندہ میں تم کو بلی وغیرہ پالنے کی اجازت نہ دوں گی ،اس طرح رشید کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا ،اور لاپرواہی پر ندامت وپشیمانی ہوگی اور وہ خود ہی دوبارہ کسی جانور کو پالنے سے توبہ کرلے گا ،لیکن اگر رشید کی والدہ شروع میں سخت رویہ اپناتی اور رشید کی خواہش کو شروع ہی میں دبانے کی کوشش کرتی تو ہوسکتا تھا کہ رشید بھڑک جاتا ،اور بغاوت پر آمادہ ہوجاتا ،لڑتا جھگڑتا ،اور ماں کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے زبردستی اپنی خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرتا اور پھر یہی اس کی عادت بن جاتی ،اور اپنی ہر خواہش وہ لڑکر یونہی پوری کرتا ،دوسری طرف اس کو یہ بھی احساس ہوتا کہ والدہ اس کو چاہتی نہیں ہیں ،اور اس کے ہر کام میں رکاوٹ بنتی ہیں ، اور یہ بات اس کے لیے جہاں مہلک ثابت ہوتی وہیں ماں کے لیے تکلیف دہ۔

یہاں پر ایک بات اور سمجھ لینا چاہیے کہ ماں کو اگر اپنے بچہ سے کوئی کام لینا ہے تو اس کو چاہیے کہ اس کام کی پوری وضاحت کرے ،مبہم انداز استعمال نہ کرے کیوں کہ ایسی صورت میں بچہ کام کو ٹھیک سے سمجھ نہیں پاتا ،اور وہ ناقص کام انجام دیتا ہے ،اور کام کو صحیح طور پر انجام نہ دینے کی وجہ سے اس کو ڈانٹا جاتا ہے ، اور کم عقلی کا طعنہ دیا جاتا ہے ،جس کی وجہ سے اس کے دماغ میں دو باتیں آتی ہیں ،ایک تو یہ کہ وہ کم فہم ہے ، چنانچہ وہ احساس کمتری کا شکار ہوجاتا ہے ، دوسری یہ کہ کام کرنے اور نہ کرنے دونوں میں ڈانٹ کھانا پڑتی ہے ،لہذا وہ کام کے نام ہی سے بھاگنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ماں یہ چاہتی ہے کہ یونس کا کمرہ صاف رہے تو اس کو یونس سے یہ نہیں کہنا چاہیے کہ اپنا بے ڈھنگا پن دور کرے اور کمرہ کو صاف ستھرا رکھے بلکہ اس کو چاہیے کہ وہ یونس کے سامنے صفائی ستھرائی کی پوری وضاحت کرے ،مثلا یہ کہے کہ دیکھو اپنے کپڑے الماری میں رکھو ، جوتے پلنگ کے نیچے رکھو ، کتابیں میز پر رکھو ، پلنگ کی چادر میلی ہو تو اس کو تبدیل کردو ، میلے کپڑوں کو ادھر ادھر مت ڈالو بلکہ کوٹھری میں رکھ دو ، اس طرح یونس کے اندر سلیقہ پیدا ہوگا اور بے ڈھنگے پن کا مفہوم صحیح طور پر سمجھ سکے گا۔

اس سے بہتر ایک طریقہ اور بھی ہے اور یہ وہ طریقہ ہے جو ایسے موقع پر کی جانے والی دسیوں نصیحتوں سے بہتر اور کہیں زیادہ موثر ہے ، یہ طریقہ بچہ کے دل میں ماں باپ کی محبت بھی پیدا کرتا ہے ،ان کی عظمت بھی بڑھاتا ہے ،اپنی لاپرواہی پر شرمندگی کے احساسات بھی پیدا کرتا ہے ،اور اس کے دماغ کو اتنا بیدار کردیتا ہے کہ معمولی سی بے ترتیبی بھی وہ محسوس کرلیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اپنی بے خیالی ولاپرواہی کا اضافی بوجھ اپنے ماں باپ پر نہ ڈالے۔

اصلاح کا یہ طریقہ قولی نہیں عملی ہے یعنی آپ بجائے کہنے اور ٹوکنے وہ کام اپنے ہاتھ سے کردیں جو کام خود لڑکے کو کرنا چاہیے تھا ،مثلا جب وہ صبح اٹھتا ہے تو تکیہ بجائے سرہانے کے پائینتانہ پڑا ہوتا ہے ، بیڈ شیٹ آدھی بیڈ پر اور آدھی لٹک رہی ہوتی ہے ، کمبل بے ترتیب بستر پر پڑا ہوتا ہے ، اب اگر آپ اس کی یہ بے ترتیبی درست کردیتے ہیں بغیر اس سے کچھ کہے ہوئے تو ہوسکتا ہے کہ ایک دو دن اس کو کوئی خیال نہ آئے ،لیکن دھیرے دھیرے پھر اس کو شرمندگی کا احساس ہونے لگے گا اور پھر یہی شرمندگی آہستہ آہستہ اس کو سلیقہ مند بنانے کا کام کرے ،اور پھر ایک وقت وہ آتا ہے جو لڑکا ان بے ترتیب چیزوں کو یوں ہی بے ترتیب چھوڑ دیا کرتا تھا ، وہ دوسروں کی بے ترتیب پڑی چیزوں کو بھی ترتیب سے رکھنے لگے گا اور ہر وقت اس کو سامان کو صحیح جگہ پہنچانے کا خیال رہے گا اس اندیشے سے کہ کہیں اس کی بے خیالی کی وجہ سے یہ کام اس کے ماں باپ کو نہ کرنا پڑ جائے۔

اسی طرح تربیت کے سلسلہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ ماں سختی اور پختگی کے فرق کو سمجھے۔ پختگی یہ ہے کہ ماں جو فیصلہ کرے اس پر قائم رہے جو معاملہ طے کرے اس کو پورا کرے اور اپنے موقف سے ذرا بھی پیچھے نہ ہٹے ،درج ذیل مثال سے پختگی کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔

بشریٰ نو سال کی ایک بچی ہے جو اپنی سہیلی کے گھر ایک پارٹی میں مدعو ہے ، پارٹی سے ایک روز قبل جب وہ اپنی والدہ سے پارٹی میں جانے کے لیے اجازت چاہتی ہے تو اس کی ماں اس کو اس شرط کے ساتھ پارٹی میں شرکت کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنا ہوم ورک پارٹی میں جانے سے پہلے کرلے ورنہ اس کو پارٹی میں جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی ، بشریٰ اس شرط کو منظور کرلیتی ہے ،لیکن وہ تھوڑی ہی دیر میں ماں سے کیے گئے وعدہ کو بھول جاتی ہے اور کھیل کود میں لگ جاتی ہے ، یہاں تک کہ جب پارٹی میں جانے کا وقت آتا ہے تو وہ

File F:\Front.tif not found.

دوڑتی ہوئی اپنی ماں کے پاس آتی ہے، اور کہتی ہے کہ وہ اس کو اس کی سہیلی کے گھر پہنچادے لیکن اس کی ماں اس کو سہیلی کے گھر پہنچانے سے انکار کردیتی ہے، کیونکہ بشریٰ نے وعدہ کی پابندی نہیں کی تھی اور اسکول کا کام گھر پر نہیں کیا تھا، بشریٰ یہ دیکھ کر اصرار کرتی ہے اور رونے لگتی ہے، اور وعدہ کرتی ہے کہ آئندہ وہ ایسا نہیں کرے گی بس اس مرتبہ جانے کی اجازت دے دی جائے، لیکن اس کی ماں اس کے رونے سے متاثر نہیں ہوتی اور اپنے فیصلہ سے پیچھے نہیں ہٹتی بلکہ وہ بشریٰ کی سہیلی کے گھر جاتی ہے اور اس سے بشریٰ کے نہ آنے پر معذرت کرلیتی ہے، اس طرح بشریٰ یہ سمجھ لیتی ہے کہ رونے سے کام نہیں چلتا اور اصرار سے ماں پر دباؤ نہیں ڈالا نہیں جاسکتا اور بات نہ ماننے کا نقصان پہنچ کر رہتا ہے۔

چوتھی مثال، محمد احمد پانچ سال کا ایک بچہ ہے، ساتھیوں میں اس کی شہرت یہ ہے کہ وہ بہت لڑاکا ہے، ذرا ذرا سی بات پر ہاتھ اٹھا لیتا ہے جس کی وجہ سے اس کی ماں کو اکثر شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ڈانٹ ڈپٹ اور سزاؤں کے بعد بھی محمد احمد اپنی حرکت سے باز نہیں آتا، ایسی صورت میں اس کی ماں کو کیا کرنا چاہیے؟

ماں کو چاہیے کہ وہ بچہ کو کہیں لے جانے کا پروگرام بنائے مثلاً خالہ کے گھر، اور نکلنے سے پہلے بچہ سے کہہ دے کہ وہ وہاں جاکر کوئی شرارت نہیں کرے گا، اپنے خالہ زاد بھائیوں میں سے نہ تو کسی کو مارے گا، نہ کسی کو چھیڑے گا اور نہ کسی کی کوئی چیز چھینے گا، اگر اس نے وہاں جاکر ایسی کوئی حرکت کی تو وہ فوراً واپس اس کو گھر لوٹا دے گی۔

محمد احمد اپنے خالہ زاد بھائیوں میں سے کسی کو بھی نہ مارنے کا وعدہ کرلیتا ہے، لیکن خالہ کے گھر پہنچنے کے پانچ ہی منٹ کے بعد اس کا ہاتھ اپنے سے چھوٹی ایک خالہ زاد بہن پر اٹھ جاتا ہے، ماں کو جب اس کی حرکت کی اطلاع ہوتی ہے تو وہ خاموشی کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑتی ہے اور اس کو لے کر گھر واپس آجاتی ہے، نہ تو وہ اس کے رونے کی پرواہ کرتی ہے اور نہ چیخنے اور چلانے کی۔

اس واقعہ کے کچھ دن کے بعد وہ پھر محمد احمد کو لے کر بازار جاتی ہے، اور جانے سے پہلے پھر محمد احمد سے کسی کو نہ مارنے کا وعدہ لے لیتی ہے، لیکن محمد احمد بازار پہنچتے ہی اس وعدہ کو بھول جاتا ہے، اور ایک چھوٹے سے لڑکے کو مار بیٹھتا ہے، ماں فوراً اس کو لے کر گھر روانہ ہوجاتی ہے، وہ روتا ہے، اور آئندہ نہ مارنے کا یقین دلاتا ہے، لیکن ماں کے ارادے کی پختگی میں اس کا رونا اثر انداز نہیں ہوتا، دو چار واقعات اس طرح کے پیش آجانے کے بعد محمد احمد کو یقین ہوجاتا ہے کہ اس کی والدہ جو کہتی ہیں وہ کر گزرتی ہیں، چنانچہ وہ اپنی اس مذموم حرکت سے باز آجاتا ہے، کیوں کہ اس کو سزا کا یقین ہوجاتا ہے، یہ طریقہ علاج اگرچہ ماں کے لیے مشکل ہے، لیکن اس کے جو نتائج سامنے آتے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ مشکل بھی آسان ہے۔

اکثر ماؤں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ان کے بچے صبح وقت پر بیدار نہیں ہوتے، اسکول جانے کا وقت ہوجاتا ہے، اور وہ آنکھیں ملتے رہتے ہیں، ایسی صورت میں ماں کو چاہیے کہ رات کو جلد سونے اور صبح سویرے اٹھنے کے لیے ایک وقت مقرر کردے اور لڑکے کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کرے کہ اب وہ بچہ نہیں ہے کہ اس کو اپنے ہر کام میں ماں کی ضرورت پڑے، اس کو چاہیے کہ اپنے کام خود انجام دے، خود سے اٹھے، اسکول جانے کی تیاری کرے، اور وقت پر اسکول جائے، اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کے نتائج کا خود ذمہ دار ہوگا۔

یہ ایک طبعی بات ہے کہ بچہ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا، اور وہ عادت کے مطابق صبح کے وقت ہر معاملہ میں ماں کا منتظر رہتا ہے اور ماں چونکہ اس سے کہہ چکی ہے کہ اب وہ اس کے کسی کام میں دخل نہیں دے گی، اور اس کو اپنے کام خود کرنے ہوں گے، لہٰذا وہ اس کی طرف سے بے فکر ہوجاتی ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لڑکے کی بس چھوٹ جاتی ہے، اور وہ اسکول جانے سے رہ جاتا ہے، اب ماں کا کام یہ ہے کہ وہ اسکول نہ جانے پر اس کی سرزنش کرے اور جب تک اسکول کا وقت رہے اس وقت تک اس کو گھر سے نکلنے نہ دے، اور گھر میں بھی اس کے ساتھ اس طرح پیش آئے کہ بچہ اپنے کو یا تو مریض سمجھے یا قیدی، اگر ماں نے ایسا کرلیا تو دو چار مرتبہ کی اس سزا کے بعد وہ بچہ خود وقت پر اٹھنے لگے گا، اور ماں کے اٹھانے کا انتظار نہیں کرے گا، اس لیے کہ پورے دن گھر میں قیدی بن کر رہنا اس کے لیے سخت تکلیف دہ ثابت ہوگا۔

☆☆☆☆☆

File F:\Front.tif not found.

حکمت وموعظت

دعوت کا منہج نبوت ایک حدیث کی روشنی میں

مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی

یہ امت امت دعوت ہے، اپنوں میں اور غیروں میں اصلاح و دعوت کا کام اس کی ذمہ داری ہے، اللہ نے اس کو اسی لیے برپا کیا ہے کہ عالم انسانیت کو صحیح پیغام دے، گرتے ہوؤں کو سنبھالے، ڈوبتوں کو سہارا دے، جو جہنم کے کنارے پہنچ چکے ان کو جہنم کی آگ سے ڈرائے، ایمان کی حقیقت لوگوں کے سامنے رکھے اور دنیا کے لیے نجات دہندہ ثابت ہو۔

خاتم النبیین ﷺ نے اپنی ساری زندگی اسی کام میں گذاری، آپ ﷺ کی بے چینی و بے کلی کو قرآن مجید میں بار بار بیان کیا گیا ہے، آپ ﷺ نے دعوت کی اہمیت بھی بیان فرمائی اور اس کا طریقہ بھی بتایا اور سب سے بڑھ کر آپ ﷺ کی سیرت پوری امت کے لیے ہر باب میں ایسا نمونہ ہے جو ہر جگہ کے لیے اور قیامت تک کے لیے ہے۔

دعوت کے میدان میں آپ ﷺ کا طرز عمل کیا تھا، اس کی تفصیلات احادیث و سیرت کی کتابوں میں بھری پڑی ہیں، ان ہی انمول خزانوں میں ایک حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے جو اس باب کے لیے شاہ کلید ہے، اس میں حکمت دعوت اور اصول دعوت کے سلسلہ میں وہ حقائق بیان کیے گئے ہیں کہ اگر ایک داعی و مصلح ان کا خیال رکھے تو راستے کھلتے جائیں اور دنیا کی یہ پیاسی قومیں جو آب حیات کے لیے ترساں ہیں، جن کے لیے دل و دماغ تک اب بھی ایمان کے دلنواز جھونکے نہیں پہنچ سکے، شاید یہ جذبہ دعوت حکمت و تربیت کے ساتھ ہمارے نوجوانوں میں ابھر آئے تو کیا بعید ہے کہ تاریخ کا دھارا بدل جائے اور مایوسیوں کے بادل چھٹ جائیں، پہلے حدیث ملاحظہ کیجیے:

”عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: لَمَّا بَعَثَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ نَحْوَ أَهْلِ الْيَمَنِ، قَالَ لَهُ: إِنَّكَ تَقْدَمُ عَلَىٰ قَوْمٍ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ، فَلْيَكُنْ أَوَّلَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَىٰ أَنْ يُوَحِّدُوا اللّٰهَ، فَإِذَا عَرَفُوا ذَلِكَ فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّ اللّٰهَ فَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِي يَوْمِهِمْ وَلَيْلَتِهِمْ“. [صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث: ۷۳۷۲]

(حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تو ان سے فرمایا: تم ایسے لوگوں کے پاس جارہے ہو جو اہل کتاب ہیں، لہٰذا تم ان کو سب سے پہلے خدا کو ایک ماننے کی دعوت دینا، جب وہ اس کو سمجھ لیں تو ان کو بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں)۔

مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد جب حالات سازگار ہوگئے تو جہاں جہاں سے تقاضے آئے اور جہاں جہاں آپ ﷺ نے ضرورت محسوس کی، ان علاقوں میں صحابہ کرام کو بھیجا، اور جانے والوں کو آپ ﷺ نے وہاں کے حالات کے اعتبار سے نصیحتیں بھی فرمائیں، مذکورہ حدیث جو کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، اس میں حضرت معاذ بن جبلؓ کے یمن بھیجنے کا تذکرہ ہے، حضرت معاذؓ بن جبل جلیل القدر صحابی ہیں، ان کے بارے میں خود آپ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ یہ حلال و حرام کے سب سے زیادہ جاننے والے ہیں، آپ ﷺ نے ان کو یمن بھیجا تھا، جس وقت وہ تشریف لے جارہے تھے، اس وقت آپ ﷺ نے ان سے نصیحت کے طور پر یہ بات فرمائی کہ تم ایسے لوگوں کے پاس جارہے ہو جو اہل کتاب ہیں، اور اہل کتاب کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ شرک میں مبتلا ہو چکے ہیں، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلا مرحلہ تو یہ ہے کہ تم ان کو توحید کی دعوت دینا، توحید کی طرف بلانا جو ہر چیز کی بنیاد ہے، عقائد کی بنیاد ہے اور اس کے بعد اعمال کی بنیاد بھی ہے۔

آپ ﷺ نے اس نصیحت میں ان کو حکمت کی ایک بات بتائی جس کا سمجھنا ایک داعی کے لیے نہایت ضروری ہے، اس حدیث میں آپ ﷺ سے دعوت کی حکمت کا یہ طریقہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی جب بھی کہیں دعوت کی بات کہے تو اس میں تدریج و ترتیب اختیار کرے، ساری باتیں ایک ساتھ پیش نہ کی جائیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جو نامانوس باتیں ہوتی ہیں ان کا فوراً قبول کرلینا مشکل ہوتا ہے، لیکن جب آدمی مانوس ہوجاتا ہے تو ان کا قبول کرنا آسان ہوتا ہے، اس لیے تمام دعوت کا کام کرنے والوں کے لیے یہ ایک اصولی بات ہے، چاہے کوئی شخص مشرکین میں کام کرے، اہل کتاب میں کام کرے، یا مسلمانوں میں کام کرے، جو لوگ بھی اصلاح و دعوت کا کام کرتے ہوں، ان

File F:\Front.tif not found.

سب کے لیے اس حدیث میں یہ حکمت ہے کہ دعوت کے کام میں تدریج اختیار کی جائے، سارا بوجھ اکٹھا نہ لادا جائے، اگر سارا بوجھ اکٹھا لادا جائے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر آدمی اس کے بارے میں سوچے گا کہ یہ ہم کر بھی سکیں گے یا نہیں؟ وہ سوچے گا کہ اتنی باتوں پر عمل کرنا مشکل ہے، لیکن جب ایک مرتبہ آدمی مانوس ہوجائے گا اور ایک چیز کو اچھی طرح سمجھ لے گا تو دوسری بات اس کو قبول کرنے میں سہولت ہوگی، معلوم ہوا دعوتی کام میں تدریج اختیار کرنے کی ضرورت ہے اور یہ خیال رکھنے کی ضرورت ہے کہ ایک ایک بات کہی جائے، جب مخاطب ایک بات سے مانوس ہوجائے پھر دوسری بات کہی جائے۔

مذکورہ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دعوتی کام میں تدریج کے ساتھ ترتیب بھی اختیار کی جائے، جو چیزیں زیادہ ضروری ہیں اور زیادہ اہم ہیں، ان کو پہلے مرحلہ پر بیان کریں، جو چیزیں کم اہم ہیں ان کو اسی ترتیب سے درجہ بدرجہ بیان کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ غیر اہم کا پہلے تذکرہ ہو اور اہم چیزوں کا بعد میں تذکرہ ہو، کوئی کسی شرک والے کے پاس جائے اور بجائے توحید کی دعوت دینے کے اس کو سب سے پہلے نماز یا اعمال کی دعوت دے تو یہ ترتیب نامناسب ہے، اس لیے کہ اعمال کی بنیاد عقائد پر ہے اور عقائد کی بنیاد توحید پر ہے، لہٰذا سب سے پہلا مرحلہ توحید کا ہے، اس حدیث میں ایک طرف آپ ﷺ نے تدریج بیان فرمائی ہے اور دوسری طرف ترتیب بھی بیان فرمائی کہ جو سب سے اہم چیز ہو اس کو سب سے پہلے بیان کیا جائے، اور ظاہر ہے کہ اہم وہ چیز ہے جو بعد میں آنے والی چیزوں کی بنیاد ہے، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے اہم چیز توحید ہے، توحید کا عقیدہ صحیح ہے تو باقی تمام چیزیں صحیح ہوں گی، اس لیے یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں، تدریج بھی ضروری ہے اور ترتیب بھی، اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اس کو قبول کرتا ہے، اس پر عمل کرنا اس کو آسان ہوتا ہے، ورنہ جو چیزیں اجنبی ہوں، جن سے آدمی مانوس نہ ہو اگر وہ سب اکٹھا کہی جائیں تو آدمی ان کو بوجھ محسوس کرتا ہے، قرآن مجید کا اسی لیے طریقہ دعوت یہ ہے کہ جو احکامات پیش کیے جاتے ہیں، اول تو وہ نرے احکامات نہیں ہوتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس میں جو اس کا ترغیبی پہلو ہے وہ بھی ذکر کیا جاتا ہے، گویا جو دوا دی جاتی ہے وہ شکر میں لپیٹ کر دی جاتی ہے، اندر سے کڑوی ہے، لیکن اوپر سے میٹھی ہے، تاکہ اس کا لینا آسان ہو، اگر کڑوی دوا نری کڑوی ہوگی تو اس کا حلق سے نیچے اتارنا دشوار ہوتا ہے، اس لیے پہلے یہ کوشش کی جائے کہ جو بات بھی کہی جائے تدریج کے ساتھ کہی جائے، دوسرے یہ کہ اس میں ترتیب کا لحاظ رہے، لہٰذا جو اہم بات ہے وہ پہلے کہی جائے۔

تدریج و ترتیب کے ساتھ ایک اور اہم بات ہے جو ہمیں قرآن مجید سے معلوم ہوتی ہے، اس کا خاص لحاظ رکھا جائے، وہ یہ کہ جو بات کہی جائے بہتر طریقہ پر کہی جائے، ارشاد الٰہی ہے:

"ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ". [النحل:۱۲۵] (اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلاتے رہیے اور اچھے طریقہ پر ان سے بحث کیجیے)۔

صاف صاف قرآن مجید میں کہہ دیا گیا کہ دعوت کے طریقہ میں نرمی اختیار کی جائے، اگر داعی ایک بات کہے گا اور اس میں کچھ سختی اختیار کرے گا تو اس کا اثر نہیں ہوگا، لیکن وہی بات اگر اپنائیت اور نرمی کے ساتھ کہے گا تو بات مؤثر ہوگی، اس لیے کہ آدمی کا مزاج یہ ہے کہ وہ سختی اور بڑائی پسند نہیں کرتا، اگر بات کہنے والا ذرا بھی یہ ظاہر کرے کہ وہ اوپر ہے اور مخاطب نیچے، تو وہ بات مؤثر نہیں ہوتی، اس لیے داعی یہ کبھی نہ سمجھے کہ ہمارے پاس علم ہے اور جس سے ہم کہہ رہے ہیں یہ بے عمل ہے، جاہل ہے، یہ ہم سے بہت نیچا ہے، ہم تو اس سے ہر طرح خطاب کر سکتے ہیں، وہ ہمارا چھوٹا ہے، اگر یہ بات ذہن میں آئی تو اول تو اصول کے خلاف بات ہے، ہر آدمی کو سمجھنا چاہیے کہ ہم میں کتنی کوتاہیاں ہیں، اور دوسرے یہ کہ دعوت کا عمل پھر غیر مؤثر ہوجاتا ہے، اس کی تاثیر کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے کو کم سمجھے، مخاطب کی اہمیت اس کے ذہن میں ہو، اور یہ سمجھے کہ جب مخاطب سے محبت کے ساتھ کہا جائے گا، اپنائیت سے کہا جائے گا، تو اس کا اثر پڑے گا اور اگر اس میں اپنائیت نہیں ہے تو پھر بات مؤثر نہیں ہوگی، دعوت کا کام خواہ آپ اپنوں میں کریں یا غیروں میں ہر میدان میں یہی صورت حال ہے، ہر جگہ کا یہ بنیادی اصول ہے کہ تدریج و ترتیب ہو۔

تیسری بات جو قرآن مجید اور آپ ﷺ کی سیرت طیبہ سے معلوم ہوتی ہے، وہ ہے برائی پر نکیر کرنا، سیرت نبوی ﷺ میں واقعات دیکھو تو اندازہ ہوگا کہ کس طرح آپ ﷺ انکار منکر فرماتے تھے، یہ بھی لازم ہے، اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ انکار منکر نہ کیا جائے تو ظاہر ہے دین ناقص ہوجائے گا، اس لیے کہ قرآن مجید میں دونوں باتیں ہیں، "يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ" کے ساتھ "يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ" کا ذکر ہر جگہ ملے گا، آپ ﷺ کی سیرت طیبہ میں اس کا پورا نمونہ

File F:\Front.tif not found.

موجود ہے، لیکن "أمر بالمعروف" اور "نهى عن المنكر" کس طرح ہو، یہ باتیں ہمیں سیرت سے معلوم ہوتی ہیں، سیرت میں جو واقعات سامنے آتے ہیں، ان میں عام طور پر ایسا نہیں ہوتا کہ آپ ﷺ کہیں حکم دیتے ہوں، بلکہ آپ ﷺ اس کام کی فضیلت بیان فرماتے تھے، اس کی اہمیت بیان فرماتے تھے، عام طور پر یہ نہیں فرماتے تھے کہ فلاں تم ایسا کرلو، بلکہ فرماتے تھے کہ فلاں کام بڑا مفید ہے، بڑا مناسب ہے، اس کے یہ فضائل وفوائد ہیں، تاکہ آدمی کے اندر خود دلچسپی و رغبت پیدا ہوجائے۔

معلوم ہوا دعوت کا مناسب طریقہ ہر جگہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے، آدمی دوسرے کی نفسیات سمجھے اور اس کے اعتبار سے اس کو خطاب کرے، وہ جذبات مجروح نہ کرے بلکہ وہ اس اپنائیت سے مخاطب کرے کہ وہ داعی کو اپنا سمجھے، جب آدمی ایک مرتبہ اپنا سمجھتا ہے تو اس کے بعد بات بڑی آسان ہوجاتی ہے، حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب بھی تم کسی سے بات کرنا چاہو تو کھلے دروازہ سے جاؤ، کبھی بھی بند دروازہ کو زبردستی کھولنے یا توڑنے اور زبردستی کھلوانے کی کوشش نہ کرو، اس لیے کہ جب تم کھلے دروازے سے جاؤ گے تو اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ تم اس کے اپنے بن جاؤ گے، تمہارے اندر اپنائیت پیدا ہوجائے گی، تم جس سماج میں جاؤ گے وہ تم کو اپنا سمجھے گا، اور جب اپنا سمجھے گا تو تم جو بات بھی کہو گے تمہاری بات توجہ سے کان لگا کر سنی جائے گی کہ اپنا آدمی کہہ رہا ہے، اور جہاں اجنبیت کا احساس ہوا تو بات مؤثر نہیں ہوگی۔

دعوت کی راہ کا کھلا دروازہ یہ ہے کہ آدمی کہیں پر بھی بات کرنے جائے تو سب سے پہلے یہ کوشش کرے کہ ان لوگوں کے مزاج کو سمجھے، وہ کس قوم سے تعلق رکھتے ہیں؟ ان کے کیا طریقے ہیں؟ ان کی کیا خصوصیات ہیں؟ اس کو سمجھ لے، اس کے بعد جب آدمی جاکر بات کرے تو ان باتوں کا دھیان رکھے، اور جو چیزیں ان کی ذرا بھی بھلائی اور خیر کی ہوں، پہلے ان چیزوں کا تذکرہ کرے تاکہ وہ لوگ مانوس ہوجائیں، وہ یہ سمجھیں کہ یہ ہماری خوبیوں سے واقف ہیں، ایسا نہیں ہے کہ یہ ہم کو نہیں جانتے، پھر دوسری بات یہ کہ مخاطبین سے تعلق کا اظہار کیا جائے، اگر ذرا بھی کوئی تعلق داعی کا مخاطبین سے ہو تو اس رشتہ کو ضرور بیان کرے کہ آپ سے تو ہمارا بڑا گہرا تعلق ہے، آپ تو ہمارے وطن کے ہیں، ہمارے علاقہ کے رہنے والے ہیں، ہماری قوم کے ہیں، غرض جو بھی رشتہ ہوسکے اس کا اظہار کرے، کیونکہ اس سے اپنائیت پیدا ہوجاتی ہے، اور اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے، پھر دعوت کا کام بڑا آسان ہوجاتا ہے، اگر دروازہ نہیں کھلا تو بڑی دشواریاں آئیں گی، آپ زبردستی کریں گے تو اس کا یہ نقصان ہے کہ آپ جو آگے خیر کی بات کہنے والے ہیں آدمی اس کو قبول نہیں کرے گا اور اجنبی سمجھے گا، اور ایسی صورت میں بات مؤثر نہیں ہوگی، تو جو دعوت کا کام کرنے والا ہو وہ کہیں بھی کام کرے، اس کے لیے ضروری ہے کہ ان پہلوؤں کو مدنظر رکھے، اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت طیبہ میں ایک دو نہیں ہزاروں مثالیں اس طرح کی موجود ہیں کہ آپ ﷺ نے کس طرح دعوت دی، آپ ﷺ نے لوگوں کو کس طرح سمجھایا، یہ مثالیں ہمارے سامنے ہیں، اور مذکورہ حدیث میں بھی ہمیں بڑی حکمت کی باتیں معلوم ہوتی ہیں کہ ترتیب وتدریج اختیار کی جائے اور بہتر طریقہ بھی اختیار کیا جائے، یہی قرآن مجید کی بھی تعلیم ہے۔

مذکورہ حدیث میں آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ سے ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلے اہل کتاب کو توحید کی دعوت دینا، دعوت توحید پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ایک تو جو ترتیب ہے، اس کے لحاظ سے فرمارہے ہیں، اس لیے کہ سب سے پہلی اور بنیادی چیز یہی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ یہ ایک مشترک پوائنٹ ہے، جس پر جمع ہونے کی دعوت دی جارہی ہے، سابقہ سطور میں اس سلسلہ کی قرآنی آیت گذر چکی ہے جس میں اہل کتاب کو کلمہ سواء پر آنے کی دعوت دی گئی ہے، ارشاد الٰہی ہے:

"قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ". [آل عمران:۶۴]

(آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہم میں تم میں برابر ہے (وہ یہ) کہ ہم صرف اللہ کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کچھ بھی شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنالے پھر اگر وہ نہ مانیں تو تم کہہ دو کہ تم لوگ گواہ رہنا کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں)۔

اگر اس آیت کو آپ سامنے رکھیں تو اور زیادہ حقیقت کھل جائے گی کہ آپ ﷺ ان کو سب سے پہلے مرحلہ پر ہی توحید کی دعوت دینے کی جو بات فرما رہے ہیں وہ اس لیے کہ وہ اس بات کے کسی نہ کسی درجہ میں قائل تھے، یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس بات کا ان کو دعوی تھا کہ ہم توحید کے ماننے والے ہیں، ہم ایک اللہ کے ماننے والے ہیں، جب اس بات کا

File F:\Front.tif not found.

ان کو دعوی ہے، تو گویا یہ وجہ مناسبت ہے، یہ وہ اشتراک ہے کہ جب آپ اس کا تذکرہ کریں گے تو ان کے اندر ایک تجسس وخیال پیدا ہوگا، اور یہ چیز ان کے ذہن میں آئے گی کہ یہ لوگ بھی کوئی الگ نہیں ہیں، یہ وہی بات کہہ رہے ہیں جس کے ہم قائل ہیں، البتہ وہ کس حد تک مانتے ہیں؟ اس کی تفصیلات کیا ہیں؟ وہ ایک الگ مسئلہ ہے، لیکن جب ان کے سامنے توحید کا نام آئے گا تو یہ ان کو مانوس کرنے کا ایک موضوع بن جائے گا، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلے توحید کی دعوت دو، گویا یہاں تدریجی اور ترتیبی مرحلہ یہی تھا اور حکمت بھی اسی میں تھی کہ وہ لوگ (اہل کتاب) توحید کے ماننے والے تھے، تو ان سے توحید کی بات اولاً کہی جائے، جب آپ توحید کی بات کہیں گے تو وہ اس بات کو تسلیم کریں گے۔

اگر آپ ایسے لوگوں کو دعوت دینے جارہے ہیں، جیسے ہمارے یہاں برداران وطن ہیں، آپ پہلے مرحلہ ہی میں جائیے اور ان سے کہیے کہ صرف اللہ کو مانو، سب بتوں کو توڑ دو، یہ شرک تمہیں جہنم تک پہنچادے گا، تو ہوسکتا ہے کہ ردعمل پیدا ہو اور پہلے ہی مرحلہ پر وہ بات سننے سے انکار کردیں، بلکہ یہاں ہوسکتا ہے آپ کو اور لمبی ترتیب اختیار کرنی پڑ جائے، جو توحید سے کوسوں دور ہیں اور شرک میں ڈوبے ہوئے ہیں، یہاں پہلے مرحلہ میں اگر آپ توحید کی دعوت دے دیں گے تو ہوسکتا ہے کہ وہ بدک جائیں، لہٰذا آپ یہاں پہلے انسانیت کی بات کہیں، وہ مشترک قدریں جو ان میں اور آپ میں ہیں ان کا تذکرہ کریں، جب ان کا تذکرہ ہوگا تو ان کے دل ودماغ کھلیں گے، گویا یہاں یہ کھلا دروازہ ہے، جب دروازہ کھل جائے گا تو آپ اندر جائیں گے، پھر آپ ان کو بتائیے کہ توحید و رسالت کیا ہے، اور تفصیلات کیا ہیں، لیکن آپ جو پہلا مرحلہ اختیار کریں گے اس میں اس ترتیب کا لحاظ رکھنا پڑے گا کہ جو بات ان کے لیے مانوس ہو، پہلے مرحلہ میں وہ بات کی جائے۔

تدریجی مرحلہ میں یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ بات کہی جائے جس سے مخاطبین مانوس ہوں، پھر جو اہم بات ہے وہ پہلے کہی جائے، ظاہر ہے توحید سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں، لیکن یہاں اس کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ اگر پہلے مرحلہ میں توحید کی بات کرنے سے مخاطبین بدکتے ہوں تو ان کے لیے بہتر یہی ہے کہ ترتیب میں وہ چیز اختیار کی جائے جو ان کے لیے مانوس کن ہو، جب وہ چیز اختیار کرلیں گے تو جو اہم چیز ہے، ان کے لیے اس کا قبول کرنا آسان ہوگا، اور اگر آپ سوچیں گے کہ سب سے اہم یہی ہے، اس کو ہم پہلے بیان کردیں، تو ہوسکتا ہے کہ یہ چیز ان کے لیے سدراہ بن جائے، اور آگے آپ کو بات کرنا مشکل ہو۔

مذکورہ حدیث میں آپ ﷺ نے بہت حکیمانہ باتیں ارشاد فرمادیں، فرمایا کہ توحید کی دعوت دینا، پھر جب وہ اس بات کو بہت اچھی طرح سمجھ لیں اور بہت اچھی طرح جان لیں، تب ان سے بتانا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر پانچ وقت کی نمازیں بھی فرض کی ہیں، معلوم ہوا توحید کا قائل ہونے کے بعد فوراً تمام احکامات نہیں سنانا ہے، اگر کسی نے کلمہ پڑھ لیا پھر اس سے پہلے ہی دن یہ کہا جائے کہ دیکھو ایک مہینہ کے روزہ فرض ہیں، پانچ وقت کی نماز فرض ہے، صاحب نصاب پر سال میں زکاۃ فرض ہے، صاحب حیثیت پر عمر میں حج فرض ہے، تو وہ سوچے گا کہ کیا کیا فرض ہے، ہم کیا کیا کریں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دین کو بوجھل سمجھ کر اس سے بددل ہوجائے گا، معلوم ہوا اس طرح کے انداز دعوت سے ترتیب بگڑ جاتی ہے، مناسب یہ ہے کہ آپ اس کو حکمت سے بات سمجھائیں، پہلے مرحلہ میں ساری باتیں نہ کہیں، بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ جب کلمہ پڑھ لیا تو نام بدلنا فوراً ضروری ہے، جب نام ہی نہیں بدلا تو یہ کیسے مسلمان ہوا، حالانکہ یہ بات ترتیب کے خلاف ہے، اور دعوت کے کام میں بہرحال ترتیب کو ملحوظ رکھنا ہوگا جیسا کہ حضور ﷺ نے اس حدیث میں وضاحت فرمائی ہے، ترتیب سے آدمی کسی کو بات سمجھتا ہے تو بات اس کے دل میں اترتی ہے، وہ بات کو اخذ کرتا ہے، اگر ایک دم سے سب چیز لاد دیجیے تو جو کھلا راستہ ہے وہ بھی بند ہوجائے گا، کوئی چیز بھی اندر نہ جائے گی، لیکن اگر تھوڑی تھوڑی چیز ڈالی جائے تو اگر چھوٹا سوراخ بھی ہے تب بھی کام ہوجائے گا۔

مذکورہ حدیث میں دعوت توحید کے بعد آپ ﷺ نے نماز کا جو ذکر فرمایا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نماز سکھا کر فارغ ہوگئے، بلکہ اس کے بعد اور بھی چیزیں ہیں، نماز کے بعد روزہ بتایا جائے، پھر زکاۃ اور حج کو بتایا جائے، پھر اور معاملات سکھائے جائیں، کیونکہ دین پوری زندگی کا نام ہے، لہٰذا زندگی کا جو بھی طریقہ ہے وہ طریقہ بتایا جائے گا، حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ دو چیزیں بتادینا کافی ہے، بلکہ یہ مثال کے طور پر دو باتیں فرمائی گئیں، اور ترتیب وحکمت سکھانے کے لیے ان دو چیزوں کا ذکر ہے، ورنہ مراد یہ ہے کہ اسی ترتیب کے ساتھ حکمت وتدریج کا خیال کرتے ہوئے ایک ایک چیز بتائی جائے، تاکہ لوگ اس سے مانوس ہوجائیں اور مکمل دین ان کے اندر پیدا ہوجائے۔

☆☆☆☆☆

File F:\Front.tif not found.

اصحاب رسول

شجاعت فاروقی کے چند مناظر

جمع وترتیب: محمد حاتم البطشی

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دارِارقم کی طرف روانہ ہوتے ہی اسلام کے سورج میں کچھ زیادہ ہی روشنی اور چمک نظر آنے لگی تھی، ان کا کلمہ حق کی شہادت ادا کرنا تھا کہ مسلمانوں کے دل خوشی ومسرت سے باغ باغ ہوگئے۔

خلعت شہادت سے سرفراز ہونے کے بعد عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ لوگوں سے پوچھتے تھے، قریشیوں میں وہ کون سا آدمی ہے جو مسلمانوں کی بات ادھر سے ادھر پہنچایا کرتا ہے؟ جب جمیل بن معمر کا نام بتایا گیا تو آپ فوراً اس کے پاس پہنچے اور اس سے کہتے ہیں:

"أعلمت یاجمیل انی أسلمت ودخلت فی دین محمد؟". (اے جمیل! کیا تجھے معلوم بھی ہے کہ میں نے اسلام قبول کرلیا ہے اور محمد کے دین میں داخل ہوچکا ہوں؟)۔

اتنا سننا تھا کہ جمیل بن معمر کوئی بات کہے بغیر اپنی چادر کھینچتے ہوئے وہاں سے چل پڑا، اس کے پیچھے عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی ہولیے، سرداران قریش کعبہ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے، جمیل جیسے ہی مسجد حرام کے دروازے پر پہنچا، زوردار آواز میں پکارنے لگا: "یامعشر قریش الا ان ابن خطاب قد صبا" (اے قریش کی جماعت! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ابن خطاب بھی بے دین ہوگیا)، عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جمیل کے پیچھے سے فوراً آواز دی: "کذب، ولکنی أسلمت وشهدت أن لا اله الا اللّٰه وأن محمداً عبده ورسوله". (اس نے جھوٹ کہا، بلکہ میں نے اسلام قبول کیا ہے اور میں نے اس بات کی گواہی دی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں)۔

قریش نے جب عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبانی ان کے اسلام کا اعلان سنا تو سب کے سب ان کے اوپر ٹوٹ پڑے، ادھر عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ان سے گتھم گتھا ہوگئے، عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوپہر تک قریشیوں سے برسرپیکار رہے، اب عمر فاروقؓ کافی تھک چکے تھے، چنانچہ بیٹھ گئے اور قریش نے انہیں گھیرے میں لے لیا، اس وقت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا:

"افعلوا مابدا لکم فاحلف باللّٰه ان لو کنا ثلاث مائه رجل لقد ترکناها لکم أو ترکتموها لنا" (تم جو جی میں آئے کرو (میں اپنا فیصلہ بدلنے والا نہیں) میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر ہم مکہ میں تین سو مسلمان ہوتے تو دو میں سے ایک فیصلہ یقیناً تھا یا تو ہم مکہ تمہارے لیے چھوڑ دیتے یا تمہیں مکہ کو ہمارے لیے چھوڑنا پڑتا)۔

اسی طرح ایک عمر رسیدہ قریشی ریشمی دھاری دار حلہ اور منقش قمیص زیب تن کیے ہوئے وہاں آپہنچا، اس نے پوچھا: ماجرا کیا ہے؟ کہنے لگے: عمر بے دین ہوگیا ہے۔

اس نے کہا: ایک شخص نے اپنی ذات کے بارے میں فیصلہ کیا ہے تمہیں کیا پریشانی ہے؟ کیا بنو کعب بن عدی کی طاقت کا تمہیں اندزہ نہیں، چلو بھاگو یہاں سے۔

عمر فاروقؓ کا بیان ہے کہ ہجرت کے بعد میں نے اپنے والد سے پوچھا: وہ شخص کون تھا؟ تو فرمایا: عاص بن وائل، یہ رشتے میں حضرت عمرؓ کے ماموں لگتا تھا۔ [دیکھئے: سیر أعلام النبلاء: ج۱/ص۱۴۱]

☆ عمر فاروقؓ کے اسلام لانے سے قبل مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ وہ مدینہ منورہ چھپ چھپا کر ہجرت کرتے تھے، مگر جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو ہجرت کے وقت تلوار لٹکائے ہوئے مسجد حرام میں آئے اور بیت اللہ کا طواف کیا، قریش مکہ بیت اللہ کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے، عمر فاروقؓ ان کے پاس آکر کھڑے ہوگئے اور انہیں مخاطب کرکے باآواز بلند گویا ہوئے:

"شاهت الوجوه واللّٰه لایرغم اللّٰه الاهذه المعاطس من أراد أن تثکله أمه أو یتم ولده أو ترمل زوجته فلیقنی خلف هذاالوادی". (یہ چہرے نامراد ہوں اللہ کی قسم، اللہ تعالیٰ ان دشمنوں کو نامراد کرے جس کی خواہش ہو کہ اس کی ماں اسے گم کردے، جو اپنے بچوں کو یتیم کروانا چاہے، جو چاہے کہ اس کی گھر والی بیوہ ہوجائے وہ اس وادی کے پیچھے مجھ سے مقابلہ کرنے آجائے)۔

عمر فاروقؓ کی شجاعت سے سارے لوگ واقف تھے، کس کی ہمت تھی جو اس مرد مجاہد کے مقابلے کے لیے نکلتا؟ چنانچہ برسرعام عمر فاروقؓ نے مدینے کی طرف ہجرت کی اور اس موقع سے دوسرے کمزور مسلمانوں نے بھی فائدہ اٹھایا اور

File F:\Front.tif not found.

تقریباً بیس کمزور و لاچار مسلمانوں نے ان کی معیت میں مدینہ کی طرف ہجرت کی۔

بخاری کی روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں:"مازلنا أعزة منذ أسلم عمر". (عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد ہم ہمیشہ شان وشوکت کے ساتھ رہے)۔[بخاری: ج۳/ص۱۳۴۸]

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہی کی ایک روایت میں ہے:"واللّٰہ مااستطعنا أن نصلی عند الکعبة ظاهرين حتى أسلم عمر". (اللہ کی قسم! عمرؓ کے اسلام لانے سے قبل ہم لوگوں کو کعبہ کے سامنے کھلے عام نماز پڑھنے کی طاقت نہیں تھی)۔[مستدرک حاکم: ج۳۳/ص۹۰]

احنف بن قیسؓ کی قیادت میں سلطنت ایران کے شہر یکے بعد دیگرے فتح ہوتے جاتے رہے تھے اور سلطنت اسلامیہ کا حصہ بنتے جارہے تھے، ادھر کسریٰ، ایران، یزدجرد بن شہریار کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی کہ وہ اپنے ملک کے علاقوں کو فتوحات اسلامیہ میں شامل ہوتے دیکھ رہا تھا، جب بھی کوئی شہر یا گاؤں مسلمانوں کے ہاتھ آتا کسریٰ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا اور کسی قریبی بستی یا شہر میں پناہ گزیں ہوجاتا، جب اس نے دیکھا کہ اسلامی فتوحات کا سلسلہ اپنے عروج پر ہے اور نہ معلوم کب کونسا شہر مسلمانوں کے قبضہ میں چلا جائے تو اس نے چین کے بادشاہ کو خط لکھ کر پناہ طلب کی، اسی طرح اس نے صغد (مشرق ایشیا میں ایک ملک کا جس کا دارالحکومت سمرقند ہے) اور ترکیا کے بادشاہ سے بھی پناہ اور تعاون طلب کیا، شاہ ترک خاقان نے کسری ایران یزدجرد کا تعاون کرنے کا وعدہ کیا، تاریخ میں لکھا ہوا ہے:

"فأنجده ملك الترك خاقان بقوة عظيمة وجمع هائل، ومالبث أن لوى عنق فرسه عائداً عندما قتل الأحنف ابن قيس اثنين من خيرة قواده في مبارزة فردية". (شاہ ترک خاقان، کسریٰ ایران یزدجرد کے تعاون کیلئے بھاری تعداد میں ایک عظیم لشکری قوت لے کر (مجاہدین اسلام سے مقابلے کے لئے آیا) ابھی کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ (مسلمانوں کے کمانڈر) احنف بن قیسؓ نے انفرادی مقابلے میں اس کے دو چنندہ کمانڈروں کو جہنم رسید کردیا، یہ دیکھ کر شاہ ترک پر اسلامی قوت کی دہشت طاری ہوگئی اور اس نے اپنے گھوڑے کا رخ اپنے ملک کی طرف موڑ دیا اور بھاگ کھڑا ہوا)۔

اب کسریٰ کو یقین ہوچلا تھا کہ ایرانی قوت اسلامی قوت کے سامنے دم توڑ چکی ہے اور مسلم مجاہدین سے مقابلہ ناممکنات میں سے ہے، چنانچہ اس نے ایران کے سارے خزانے اکٹھا کرنا شروع کردیے، اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے خزانوں کے ساتھ شاہ ترک یا شاہ چین کے پاس چلا جائے اور وہیں اپنی بقیہ زندگی گزار دے، اس موقع پر شاہ ایران اور اس کی رعایا میں جو گفت و شنید ہوئی اسے ملاحظہ فرمائیں:

رعایا: آپ کیا چاہتے ہیں؟

کسریٰ: میں شاہ ترک خاقان یا شاہ چین کے پاس جاکر انہیں کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔

رعایا کو اپنے خودغرض اور مفاد پرست بادشاہ کی بات سن کر بڑا غصہ آیا اور انہوں اس وقت بادشاہ سے جو بات کہی وہ مسلم مجاہدین کی پاکیزگی، رواداری اور عدل وانصاف کا منھ بولتا ثبوت ہے۔

رعایا نے اپنے بادشاہ کو مخاطب کرکے کہا:

"مهلاً فان هذا رأى سوء، انك انما تأتي قوماً في مملكتهم وتدع أرضك وقومك؟ ولكن ارجع بنا الى هولاء القوم فنصالحهم، فانهم أوفياء وأهل دين، وهم يلون بلادنا، وان عدواً يلي بلادنا أحب الينا من عدو يلينا في بلاده ولا دين لهم ولاتدري ماوفاؤهم". (رک جاؤ، تمہاری رائے انتہائی غلط ہے، تم تو خود ایک حکومت میں جاکر پناہ گزیں ہوجانا چاہتے ہو اور اپنے ملک اور قوم کو (حالات کے رحم وکرم پر) چھوڑ دینا چاہتے ہو؟ بلکہ تم ہمارے ساتھ ان لوگوں (مسلمانوں) کے پاس چلو تاکہ ہم ان سے مصالحت کرلیں، کیونکہ یہ مسلمان وفادار اور دیندار ہیں، اور ہماری سرزمین سے وہی قریب بھی ہیں، ہمارے وہ دشمن جو ہماری سرزمین سے دور اپنے ملکوں میں ہیں، ان کے پاس کوئی دین بھی نہیں ہے، اور ہم ان کی وفاداری کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے)۔

مگر کسریٰ نے اپنی رعایا کی تجویز ماننے سے انکار کردیا، اس وقت رعایا نے بھی اپنے بادشاہ کی بات ماننے سے انکار کردیا اور کہنے لگے: "تمہیں جہاں جانا ہے جاؤ، مگر اس ملک کے سارے خزانے چھوڑ جاؤ، ہم اپنے ملک کے خزانے کسی دوسرے ملک میں منتقل نہیں ہونے دیں گے، لیکن کسریٰ نے انکی بات ماننے سے انکار کردیا، انہوں نے کہا: ہم کسی بھی قیمت پر تمہیں نہیں چھوڑیں گے، چنانچہ رعایا نے اسی وقت اپنے بادشاہ کو معزول کردیا، جب کہ اس کے حاشیہ بردار اور وزراء اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

اب یہ جھگڑا خانہ جنگی میں تبدیل ہوگیا اور بادشاہ کے حاشیہ برداروں اور رعایا میں جنگ ہونے لگی، رعایا نے بادشاہ کو شکست دے کر پورے

File F:\Front.tif not found.

خزانے اس سے چھین لیے اور اسے بے دخل کر دیا، اس کے بعد انہوں نے احنف بن قیسؓ کو یہ پوری داستان لکھ بھیجی، مسلمانوں نے خبر ملتے ہی کسریٰ کا پیچھا کیا اور مقام مرو پر اس سے قتال کیا۔

وہاں اس نے اپنا ساز وسامان چھوڑ دیا اور بھاگ کر سرزمین بخارا میں فرغانہ نامی ایک جگہ چلا گیا اور وہیں امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اور امیر المومنین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی زمانے تک رہا، ادھر ایرانی قوم کا وفد احنف بن قیسؓ کی خدمت میں پہنچا اور مسلمانوں سے معاہدہ کرلیا، وفد اپنے ملک کے خزانے اور اموال احنف بن قیسؓ کے حوالے کر کے اپنے ملک میں واپس چلا گیا۔

مسلمانوں نے ان کے ساتھ کیے گئے عہد و پیمان کا پورا لحاظ کیا اور اب وہ اپنے ملک میں سکون وچین کے ساتھ خوشگوار زندگی گزرانے لگے، انہیں جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ مسلمانوں کے زیر نگیں ان کی زندگی اپنے شاہوں کے زیر تسلط زندگی سے کہیں زیادہ بہتر اور خوشگوار ہے، انہیں کبھی احساس نہیں ہوا کہ وہ کسی دوسرے کے زیر نگیں ہیں۔

مسلمانوں کی وفاداری اور عدل وانصاف ان کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا، جو ان کے لیے قابل فخر بھی تھا اور قابل رشک بھی، اسی لیے کہتے ہیں کہ اصل فضل وکرم، شان وخوبی اور اعلیٰ ظرفی وہ ہے جس کی گواہی دشمن بھی دیں، عربی کے ایک شعر کا یہ ٹکڑا اس واقعہ کے مناسب حال ہے:

والفضل ما شهدت به الأعداء

(فضیلت اور خوبی تو وہی ہے جس کی گواہی دشمن بھی دیں)۔

☆☆☆☆☆

ایک علمی، فکری وتحقیقی پیش کش

شیعیت-تحلیل وتجزیہ

تالیف:-محمد نفیس خاں ندوی

شیعوں کی تاریخ، ان کے عقائد ونظریات اور مذہبی رسومات کی تفصیلات نیز اسلام واہل اسلام پر شیعوں کے اعتراضات اور ان کے علمی وتحقیقی جوابات۔

صفحات:- 336 قیمت:-200 روپئے

رابطہ

رابطہ: سید احمد شہید اکیڈمیؒ رائے بریلی

موبائل نمبر:9919331295

(سات جلدوں پر مشتمل) آسان ہندی زبان میں ترجمہ وتفسیر

تفسیر فاروقی اور ہندی ترجمہ قرآن مجید کا پیغام

از -(مولانا) مفتی محمد سرور فاروقی ندوی

یہ مسلم وغیر مسلم اور نومسلموں کے لیے آسان ہندی زبان میں تفسیر ہے جس میں ہر روز کے سبق کے اعتبار سے تقریباً دس دس آیتوں کا ترجمہ پھر ہر آیت کی الگ الگ تفسیر نمبر ڈال کر لکھی گئی ہے، پھر ہر آیت کا پہلے شان نزول، اس سے متعلق احادیث اور مسائل کے ساتھ غیر مسلموں کے عقائد وسوالوں کے جوابات اور سائنسی تحقیق وفضائل کا ذکر کیا گیا ہے۔

ناشر: مکتبہ پیام امن، ندوہ روڈ، ڈالی گنج، لکھنؤ

موبائل نمبر:09919042879, 0998449015

File F:\Front.tif not found.

محاسن اسلام

سیاست، علم اور اسلام

سعید احمد ندوی

ہر وہ مسلمان جس کا رشتہ قرآن کریم سے قوی تر ہے، اس حقیقت کو بخوبی جانتا ہے کہ اسلام ہی دنیا کا تن تنہا وہ مذہب ہے جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام انسانیت کے لیے منتخب فرمایا ہے جیسا کہ فرمان خداوندی ہے: ''کہ دین تو اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے'' [آل عمران:۱۹]، مزید اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ دین اسلام تمام انبیاء کرام ومرسلین عظام کا دین ہے چنانچہ حضرت نوح (علیہ السلام) کے متعلق ارشاد ہے: ''اور مجھے حکم ہے کہ میں فرماں بردار ہی رہوں''۔[یونس :۷۲]، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں ہے: ''جب ان سے ان کے رب نے کہا کہ سر تسلیم خم کردو، وہ بولے کہ میں تو رب العالمین کا ہو چکا ہوں'' [البقرۃ:۱۳۱]، حضرت یوسف (علیہ السلام) کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشا دہے: ''اے ہمارے رب! مجھے مسلمان اٹھانا اور نیک لوگوں میں شامل فرمانا'' [یوسف:۱۰۱]، حضرت سلیمان اور ملکہ سبا بلقیس کے تعلق سے ہے: ''میں سلیمان کے ساتھ اللہ کے لیے مسلمان ہوتی ہوں جو جہانوں کا پروردگار ہے''۔[النمل:۴۴] فرعون کے جادوگروں کے بارے میں ارشا دہے: ''اے ہمارے رب! ہم پر صبر کے دہانے کھول دے اور ہمیں ایمان کے ساتھ اٹھا'' [الاعراف:۱۲۶] حضرت عیسیٰ مسیح (علیہ السلام) کے حواریوں کے سلسلہ میں ہے: ''ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلمان ہیں'' [آل عمران:۵۲]۔

چنانچہ ہر وہ شخص جو اسلام کی ہمہ گیریت پر پختہ یقین رکھتا ہے، اسے ہر نبی کا مذہب خیال کرتا ہے اور قرآن کریم میں بیان کردہ انبیاء کرام کے تمام واقعات کو حق اور سچ سمجھتا ہے، وہ انبیاء کرام کو ایک سیاسی مدبر کی حیثیت سے بھی تسلیم کرتا ہے کہ یہ حضرات سیاست کے باب میں ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہیں اور اس کی سچی تصویر سے لوگوں کو روشناس کرانے والے ہیں، جنھوں نے یہ حقیقت دو دو چار کی طرح واضح کردی کہ سیاست دین اسلام کا ایک اہم ترین جزو ہے اور آج کا سیاسی بگاڑ دین اسلام سے انحراف کا نتیجہ ہے جیسا کہ تاریخ انسانی اس پر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی بگاڑ کے خاتمہ کے لیے انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا اور یہ سلسلہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تمام فرمایا۔

بعض انبیاء کرام ایسے بھی ہوئے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ حکومت وخلافت، عہدہ ومنصب، اقتصادیات ومعاشی باریکیوں سے نوازا جیسے حضرت داؤد و سلیمان (علیہما السلام) اور حضرت یوسف (علیہ السلام) مصر کی حکومت میں وزیر مالیات تھے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) یہودیوں کے لیے فرعون کے ظلم وستم سے نجات دہندہ تھے، حضرت شعیب (علیہ السلام) قوم مدین کے معاشی بگاڑ کے سخت مخالف تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبوت کے ساتھ ساتھ ایک حاکم بھی تھے، ایک طرف مشرکین ویہود سے آپ معاہدے کررہے ہیں، حکمرانوں وفرمانرواؤں سے خط وکتابت کررہے ہیں وہیں دوسری طرف لشکروں کی قیادت فرمارہے ہیں اور مدینہ منورہ کے داخلی نظام کو مستحکم فرمارہے ہیں، قرآن کریم کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ انبیاء کرام کا رشتہ علوم ومعارف اور مختلف پیشوں سے بھی خاصا مضبوط تھا جہاں وہ علوم و معرفت کے دریا بہارہے تھے، وہیں وقت کے مکاروں اور دجالوں سے پنجہ آزما تھے نیز معاشرہ کی خوشحالی وترقی کے لیے کوشاں تھے، حضرت نوح (علیہ السلام) کشتی بنایا کرتے تھے، حضرت داؤد (علیہ السلام) لوہے کی زرہ بناتے تھے، حضرت یوسف (علیہ السلام) کو معیشت کا گہرا علم عنایت کیا گیا، حالانکہ اگر اللہ چاہتا تو حضرت نوح کے لیے کشتی پیدا فرمادیتا، اور حضرت داؤد کے لیے آسمان سے لوہے کی زرہ نازل فرمادیتا، لیکن سنت الٰہی اور انبیاء کرام کا طریقہ یہ ہے کہ دنیوی اسباب اختیا کیے جائیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو مختلف علوم سیکھنے اور ان کے ذریعہ سے انسانوں کی خدمت کی ترغیب دی، آپؐ نے مدینہ کے اردگرد خندق کھودنے کی تجویز قبول فرمائی اور لشکر کے بارے میں تحقیق فرمائی خاص کر قریش کے جانوروں کے سلسلہ میں دریافت فرمایا تاکہ لشکر کی تعداد کا صحیح اندازہ لگایا جاسکے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیا ضرورت تھی، اللہ تعالیٰ سے تعداد دریافت فرما لیتے، امت کو یہ سبق دینا تھا کہ سیاسی اور فوجی اسباب اختیار کیے جائیں اور اس دنیا میں رہ کر اسباب وذرائع کو بروئے کار لایا جائے، جو بھی قرآن وحدیث وسیرت نبویؐ کے ان پہلوؤں کا نظر انداز نہیں کرے گا وہ اسلام کو آج بھی علم اور سیاست کے شانہ بشانہ کھڑا دیکھے گا۔

File F:\Front.tif not found.

کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ اسلام سیاسی اعتبار سے قیادت کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے کیونکہ آج کی سیاست بڑی ہی گندی اور غیر معیاری ہے جبکہ اسلام ایک پاک وصاف مہذب دین ہے حالانکہ ان کا یہ دعویٰ ایک بے بنیاد دعویٰ ہے، قرآن وحدیث، تاریخی واقعات ومشاہدات کا کھلا انکار ہے کیونکہ قرآن وحدیث میں جا بجا حکومت، عدالت، معاہدات، جنگ وصلح پر روشنی ڈالی گئی ہے، تاریخ بھی اس دعویٰ کو سرے سے خارج کر دیتی ہے کیونکہ اسلام نے اپنے احکامات وتعلیمات کے ذریعہ سے دنیا کی سیاست میں کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے ہیں، اسلامی اقدار زندگی کے تمام انقلابات و حالات سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں، اور آج بھی اسلام پورے دم خم کے ساتھ غیر معمولی سیاسی کردار ادا کر رہا ہے اور یہ دعویٰ کہ دین اور سیاست دو متضاد چیزیں ہیں، اس پر بھی اسلام سیاسی طور پر الحاد وگلوبلائزیشن کے علمبرداروں سے نبرد آزما ہے، دین اسلام کو اللہ تعالیٰ نے پوری انسانیت کا دین اس لیے قرار دیا ہے تاکہ وہ سیاسی اعتبار سے پوری دنیا پر حق وانصاف کے ساتھ حکمرانی کرے اور اسے امن وسلامتی، سعادت وکامرانی کا گہوارہ بنائے، گلوبلائزیشن اور الحاد کے علمبرداروں کا یہ دعویٰ کہ سیاست ایک گندگی ہے، ان کی اسلامی سیاست سے جہالت پر مبنی ہے اور کیوں نہ ہو کہ وہ حقیقت سے اندھے، بہرے ہو گئے، خالق کائنات کے منکر بن گئے، انھوں نے یہ یقین کر لیا کہ انسان اصلاً جانور تھا، وہ اللہ تعالیٰ کی لائق اکرام مخلوق نہیں ہے، اس لیے فطری طور پر ان کا یہ بھی یقین ہو گیا کہ سیاست حیوانیت کا دوسرا نام ہے، مکر و فریب، دھوکہ وچال بازی اور استحصال اسکی بنیادیں ہیں، حالانکہ ایمان والوں کا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس انسان کو بنی نوع انسان کی نسل میں وجود بخشا، اسے معزز ومکرم بنایا، اس کا یہ بھی یقین ہے کہ حق و انصاف ہی اسلامی سیاست کی بنیاد ہے، انسانی تاریخ بھی شاہد عدل ہے کہ انبیاء کرام اور انکے متبعین نے امن وسلامتی کی خاطر ہی دنیا کی قیادت فرمائی، انسانیت جب بھی انبیاء کرام کی سیاست سے منحرف ہوئی ذلیل وخوار ہوئی، آپسی ظلم وزیادتی کا شکار ہوئی، کسمپرسی کے بادل اس کے وجود پر سایہ کے طرح سے چھا گئے۔

موجودہ حالات کے تناظر میں آج دنیا میں ظلم و انارکی اور لاقانونیت کے جو بھی دلدوز مناظر دیکھنے کو مل رہے ہیں، ان کی اصل وجہ گلوبلائزیشن کی اسلام مخالف سیاست ہے، جمہوریت اور علمی ترقی کے باوجود جنگوں کا بازار گرم ہے، موسمیاتی مشاکل درپیش ہیں، حکومتیں اور معاشرہ موجودہ طرز حکومت سے کراہ رہی ہیں، بعض ممالک میں اشیاء خورد ونوش کی قلت ہے، لوگ نفسیاتی پریشانیوں سے دوچار ہیں، جس کی وجہ سے خودکشی کے واقعات میں کافی اضافہ ہوا ہے حتی کہ مالدار اور مشہور زمانہ حضرات موت کو گلے لگا رہے ہیں، دنیا کے یہ حالات زبان قال سے نہیں تو زبان حال ہی سے فریاد کر رہے ہیں کہ ہمیں ایک ایسا سیاسی نظام چاہیے جہاں پر ہم نفسیاتی غلامی سے آزاد ہوں، ہمارے قائدین ولیڈران ہمارے لیے فکر مند ہوں، ہماری پیٹھوں پر ٹیکسوں کا وہ اضافی بوجھ نہ ہو جس نے ہماری کمر توڑ کر رکھ دی ہے، ہماری عزتیں محفوظ ہوں، جہاں ہم بے سروسامان ہو کر بھی ایک آسودہ زندگی گزار سکیں۔

انسانیت کی اس فریاد کو اگر ہم محسوس کرتے ہیں تو ہمیں ایک ایسے نظام کا رخ کرنا پڑے گا جہاں خلیفۂ وقت مسجد کے فرش پر ہاتھ کو تکیہ بنا کر آرام فرماتا ہے، اور رعایا کا اتنا خیال کہ پوری رات رعایا کی خبر گیری میں گزار دیتا ہے، جہاں خلیفہ کی بیٹیاں صرف اس وجہ سے پیاز کھا کر گزارہ کرنے پر مجبور ہیں کہ ان کے باپ کو کل اللہ کے حضور پیش ہونا ہے، جی ہاں! جہاں کے شاہی گھرانوں کا یہ حال ہے لیکن وہاں کی رعایا کا حال یہ ہے کہ پوری مملکت میں زکوٰۃ کا مستحق ملنا محال ہے۔

رہا سوال اسلام اور علوم ومعارف کا، تو اسلام نے پہلے ہی یہ حقیقت آشکارا کر دی کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کون ومکان کا خالق ہے "اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے" [الرعد:۱۶]، اور اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو ایک بہترین نظام عطا کیا ہے، مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے سورج کے بارے میں ارشاد فرمایا: "اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف رواں دواں ہے یہ اس زبردست خوب جاننے والے کا مقرر کیا ہوا ہے" [یٰسٓ:۳۸] اور اپنے بارے میں حق سبحانہ نے فرمایا: "آسمانوں اور زمین کو وجود بخشنے والا ہے اور جب وہ کسی کام کا فیصلہ فرما لیتا ہے تو اس سے کہتا ہے ہو جا بس وہ ہو جاتا ہے" [البقرۃ:۱۱۷] یعنی اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو بغیر کسی سابقہ مثال کے اور اپنی بے نظیر کاریگری کا شاہکار بنایا ہے، اس کائنات کو وجود بخشنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو اعزاز بخشا، اس طور پر کہ انہیں تمام مخلوقات کے اسماء تلقین فرمائے، "اور اس نے آدم کو تمام نام سکھا دیے پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا پھر فرمایا کہ مجھے ان تمام (چیزوں) کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو، وہ بول اٹھے کہ تیری ذات پاک ہے ہم کو تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہم کو سکھا دیا، بیشک تو بڑے علم والا حکمت والا ہے" [بقرۃ:۳۲، ۳۳]، اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے آخری پیغام کی ابتدا تعلیم وتعلم سے فرمائی، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اپنے رب کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا" [العلق:۱] پھر اس نے اپنے مومن بندوں کو طلب علم ومعرفت پر کچھ اس انداز سے ترغیب دی: "آپ کہہ دیجیے کہ زمین میں چلو پھرو پھر

File F:\Front.tif not found.

دیکھو" [الأنعام:۱۱]،معلوم ہونا چاہیے کہ انبیاء کرام،عصر حاضر کے مسلمان اورعلوم ومعارف کے مابین کچھ تعارض نہیں کیونکہ علم نافع ہی اسلام کا مقصود ہے ،دور حاضر میں مسلمانوں کی علم بیزاری تحریف شدہ ادیان کی دین ہے ،اسی واسطے اسلام ادیان محرفہ سے ہمیشہ برسر پیکار رہا،اسی انحراف کی بیخ کنی کی خاطر انبیاء کرام مبعوث فرمائے گئے،اس لیے یہ ٹکراؤ دینی انحراف سے ہے نہ کہ علم سے ،مزید برآں قرآن کریم میں بہت سے ایسے حقائق بیان کے گئے جو اس وقت دریافت نہ ہوئے تھے جن تک انسان کی بہت بعد میں رسائی ممکن ہوئی، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ قرآن وحدیث نے کسی علمی حقیقت کو فراموش کیا ہو،اسلام میں علمی حقائق کی جو توضیح کی گئی ہے وہ اس کی عملی تفسیر ہے اور یہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کا مقتضی ہے :"تم اپنی دنیا کے بارے میں زیادہ جانتے ہو"[مسلم]، پوری اسلامی تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ کسی عالم کو کسی تحقیق یا کسی رائے پر کوئی سزا دی گئی ہو جبکہ دیگر مذاہب میں ایسے واقعات جابجا ملتے ہیں،اسی وجہ سے اسلام ان جاہل صوفیاء کی پرزور مذمت کرتا ہے جو علوم ومعارف کے مخالف ہیں اور توکل کی غلط تشریح کرتے ہیں ، اسباب وسائل ترک کردینے پر مصر ہیں حالانکہ ان کی یہ سوچ سیرت نبویؐ کے عین مخالف ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم توکل کے اعلیٰ ترین مقام پر تھے،اس کے باوجود اسباب اختیار فرمائے ، دشمنان اسلام ہمیشہ سے اسلام کو ایک روحانی وشخصی مذہب قرار دینے کے لیے کوشاں رہے ہیں،انکی یہ کاوشیں شرعی حیثیت سے بھی بے بنیاد ہیں اور تاریخی اعتبار سے بھی ہمیشہ ضائع ورائیگاں ثابت ہوئیں۔

☆☆☆☆☆

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی جدید ودیدہ زیب طباعت

☆تفسیر ماجدی

(منزل کے اعتبار سے--------۷/منزل،۷/حصے)

از مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

کل صفحات: ۴۰۶۰ مجموعی قیمت: ۳۲۵۰روپے

ڈاک خرچ کے ساتھ صرف ۱۸۰۰روپے میں

☆أضواء على الأدب الاسلامی

از حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

صفحات: ۱۴۰ قیمت: ۱۰۰روپے

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام

پوسٹ بکس نمبر ۹۳،ندوہ کیمپس،ندوۃ العلماء،لکھنؤ

فون نمبر:0522-2741539، موبائل نمبر:9889378176

ای میل۔ airpnadwa@gmail.com

فولادی ارادہ

ڈاکٹر عائض قرنی

عالم اسلام کا ایک مسلمان طالب علم مغرب میں خاص طور سے لندن پڑھنے گیا، طالب علم دیندار اور نمازی تھا، روز علی الصباح اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے وضو کرتا اور نماز پڑھتا، گھر کی ایک بڑھیا روزانہ اسے پابندی سے ایسا کرتے دیکھتی، کچھ دنوں کے بعد اس سے رہا نہیں گیا تو اس سے پوچھ لیا کہ تم یہ روز اتنے سویرے کیا کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا: میرے خدا نے مجھے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے، کہنے لگی: وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہاں کی زمستانی فضا میں تم اپنی عبادت مؤخر کر سکتے ہو، پوری نماز نیند لے کر پڑھ لیا کرو، طالب علم نے کہا: نمازوں کے اوقات متعین ہیں، میں تاخیر سے پڑھوں گا تو قبول نہ ہوں گی، بڑھیا نے اپنا سر ہلا کر کہا: "کیا فولادی ارادہ ہے، اس سے تو لوہا بھی ٹوٹ جائے گا"۔

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

File F:\Front.tif not found.

رسید کتب

تعارف وتبصرہ

● .....محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

☆قاموس النحو

(اردو زبان میں علم نحو کی پہلی ڈکشنری)

انسانی ذہن مختلف مزاج کا حامل ہوتا ہے، کسی کو بات کسی طریقہ سے سمجھ میں آتی ہے کسی کو کسی طریقہ سے۔اسی وجہ سے تعلیم وتدریس کے موضوع پر لکھنے والے مختلف طرز تالیف اختیار اور نئے نئے انداز میں مسائل کو سمجھانے کا تجربہ کرتے رہے ہیں۔اسی طرح کا اک نیا تجربہ مولانا عزیز الرحمٰن ندوی کوپا گنجوی صاحب استاد مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر کی نحوی لیاقت وقابلیت سے سامنے آیا ہے۔

مولانا موصوف کی زیرِ تبصرہ کتاب ”قاموس النحو“ اردو زبان میں علم نحو کے مسائل والغاز کی پہلی ڈکشنری ہے، جو عربی نحو کی تصنیف وتالیف میں اپنی اک الگ طرز کی حامل ہے۔اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں نحو کے مسائل ومفرادات کو حروفِ تہجی کے اعتبار سے درج کیا گیا ہے، سو سے زائد مشکل الفاظ کا حلِ اعراب اور مشکل جملوں کی نحوی ترکیب پیش کی گئی ہے اور زبان آسان اور عام فہم ہے تاکہ اہل علم کے ساتھ ساتھ طلبہ کے لیے بھی مفید اور معاون ثابت ہو۔اس طرح یہ کتاب نئے علمی اور جدید اعرابی انداز میں لکھی گئی ہے، امید ہے کہ اس سے نہ صرف نحوی مسائل و اعراب کو سمجھنے اور عربی اشعار کے اعراب ومفہوم کے مطالعہ کا اچھا موقعہ ملے گا بلکہ قرآن کریم کے اعراب کی وضاحت کرنے اور وجوہِ اعراب کا ادراک کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہوگی۔

قاموس النحو جس کی تقریظِ اول دار العلوم دیوبند کے جلیل القدر استاد حدیث مولانا نعمت اللہ اعظمی مدظلہ کے قلم سے، تقریظِ ثانی عربی زبان کے مایہ ناز ادیب و خطیب مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کے قلم سے اور تقریظِ ثالث مولانا سرفراز احمد اصلاحی ندوی صدر مدرس مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے قلم سے ہے، اس کے مصادر ومراجع پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف محترم نے ان نحوی مسائل ومفردات والغاز کو اکٹھا کرنے میں اور ان کی نحوی پیچیدگیوں کو حل کرنے میں مصادر پر اپنی وسیع نظر سے کام لیا ہے اور تقریباً تمام ہی نحو کی مشہور امہات الکتب سے استفادہ پیش کیا ہے۔

یہ تالیف ۳۶۱/ میانہ سائز صفحات پر مشتمل ہے، کتابت وطباعت عمدہ ہے، مکتبہ احسان ڈالی گنج، لکھنؤ نے اس کو شائع کیا ہے، مکتبہ احسان کے علاوہ کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند، کتب خانہ نعیمیہ، مؤناتھ بھنجن، مکتبہ فہیم، مؤناتھ بھنجن پر دستیاب ہے۔

قیمت ۲۵۰/ روپیہ تجویز کی گئی ہے، رابطہ نمبر ۰۵۲۲۳۲۰۶۹۰۷ درج ہے۔

☆ہجو گوئی عہد بنی امیہ میں

عربی ادب کی تاریخ کے حوالہ سے اردو میں تصنیف وتالیف کا رواج کم ہی رہا ہے، اردو داں حضرات کو اس موضوع پر مطالعہ کے لیے بہت کم مواد دستیاب ہوتا ہے، عام طور پر عربی داں اور انگریزی داں افراد ہی اس موضوع پر سیر حاصل مطالعہ کر پاتے ہیں۔اس پہلو سے اگر دیکھا جائے تو ڈاکٹر عبد المجید ندوی، صدر شعبۂ عربی گوہاٹی یونیورسٹی، آسام کی تالیف ”ہجو گوئی عہدِ بنی امیہ میں“ بڑی افادیت کی حامل ہے۔درمیانی سائز کے ۲۴۸/صفحات پر مشتمل اس کتاب کو مصنف محترم نے سات ابواب پر تقسیم کیا ہے، جن میں بعض ابواب کئی فصلوں پر مشتمل ہیں؛ پہلا باب عہدِ جاہلیت کے عرب کے احوال اور اسلام سے قبل عربوں کی شاعری کا سرسری جائزہ پیش کرتا ہے، دوسرا باب عربی شاعری پر بعثتِ نبوی کے اثرات پر مشتمل ہے، تیسرے باب میں عہدِ بنی امیہ کے سیاسی وثقافتی حالات وتقاضوں کا ذکر ہے، چوتھے باب میں عہدِ بنی امیہ میں شعر وشاعری کے مروجہ اقسام اور ان کے نمائندہ شعراء کا تذکرہ ہے۔پانچویں باب میں ہجویہ شاعری کا تنقیدی جائزہ ہے، چھٹے باب میں عہدِ بنی امیہ میں ہجو گوئی اور اس کے اسباب سے بحث کی گئی ہے، جب کہ ساتویں آخری باب میں ہجو گوئی اور موالی شعراء کا تذکرہ ہے۔کتاب کے آخر میں مراجع ومصادر کی فہرست پیش کی گئی ہے، جس پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے اور عربی ادب و تاریخ ونقد کی امہات الکتب سے استفادہ کیا ہے۔

کتاب کی زبان بھی شستہ اور بلیغ ہے، خاص طور پر اشعار کے ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اردو و عربی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت ہے۔

کتاب کے شروع میں پیشِ لفظ اور مقدمہ ہے، مقدمہ خود صاحبِ کتاب کا ہے جس میں کتاب کے مشمولات کا معروضی جائزہ پیش کیا گیا ہے، جب کہ پیشِ لفظ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ کے قلم سے ہے۔

کاغذ عمدہ ہے، طباعت وکمپوزنگ قابلِ قدر ہے، ٹائٹل سادہ اور مجلد ہے، دانش بک ڈپو، گوہاٹی آسام سے شائع ہوئی ہے، رابطہ کے لیے موبائل نمبر ۹۸۶۱۶۷۷۴۱ اور قیمت ۲۵۰/روپیہ درج ہے۔

☆☆☆☆☆

File F:\Front.tif not found.

دعوت وعزیمت

حضرت سید احمد شہید کی خدمات اور خصوصیات

محمد امین حسنی ندوی

اسلام ایک مکمل دین ہے زندگی کا وہ ایک دستور ہے ، ساری دنیا کے لیے وہی ایک Guide ہے، قیامت تک کے لیے خداوند قدوس کا وہی منتخب کردہ ایک مذہب ہے، ارشاد خداوندی ہے:"اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" اسلام کو اللہ رب العزت نے اپنے لیے پسند فرمایا ،او راپنی رضامندی کی مہر یہ کہہ کر ثبت کردی کہ:"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ لَکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اور ہر علاقہ میں اسلام کے ایسے جانباز داعی سامنے آتے رہے اور اسلام کے شجر سایہ دار کو سرسبز و شاداب کرتے رہے ، اسلام کو ذہنی ، اخلاقی، اعتقادی، تربیتی انقلاب کی یاد دلاتے رہے، ایثار و قربانی کے نمونے پیش کرتے رہے، صبر وتحمل کی مثالیں قائم کرتے رہے، زہد وتقویٰ کا درس دیتے رہے، جاہلانہ رسم ورواج سے ٹکر لیتے رہے۔

اسلام کے ابتدائی تیس سال تک وہ حضرات مسلمانوں کی زندگی کے لیے نمونہ بنے رہے اور جہاد ودعوت کا فریضہ انجام دیتے رہے، جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن تربیت میں پرورش پائی تھی، یہ وہ اصحاب دعوت وعزیمت او رملت اسلامی کے وہ پاک دل وپاکباز جانباز و جاں فروش حضرات تھے، جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ رضائے الٰہی کے لیے وقف تھا، جن کی ایک ایک سانس خداوند قدوس کی وحدانیت کا اعلان تھی، جن کو نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلہ کی پرواہ، جن کو تمنا تھی تو صرف جنت کی اور پرواہ تھی تو صرف رضائے الٰہی کی، فنائیت وفدائیت اور جاں سپاری وجاں فروشی کی یہ روح ہر زمانہ اور ہر خطہ میں مختلف اوقات میں ظہور پذیر ہوتی رہی، صحابہ کے بعد تابعین، تابعین کے بعد تبع تابعین، غرض کہ اگر اسلامی دعوت اور کاز کے لیے جدوجہد کی تاریخ مرتب کی جائے گی تو وہ موتی پروئے ہوئے اس ہار کی طرح ہوگی جس کا ہر موتی آفتاب وماہتاب کی چمک رکھتا ہے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ بھی اس سنہری کڑی کے ایک درہ شاہوار ہیں، انہوں نے اس تختی براعظم میں جس عظیم اسلامی تحریک کی رہنمائی کی اسکی نظیر جامعیت، قوت، تاثیر اور جذبہ میں اور طریقہ نبویؐ سے قریب تر ہونے اور جماعت صحابہ کے نمونے کو اپنانے میں نہ صرف تیرہویں صدی میں ہمیں نظر نہیں آتی ہے جو اس کا عہد ہے بلکہ گذشتہ کئی صدیوں میں بھی اس جماعت کا کوئی سراغ نہیں ملتا، سید صاحب نے مادی سروسامان سے یکسر محرومی کے باوجود محض عشق حق کی حرارت سے اس ظلمت زار میں سیکڑوں چراغ روشن کئے جو اسلامیت کے درخشاں ترین دوروں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

سید صاحبؒ کی دعوتی فتوحات

سید صاحبؒ کی دعوتی اور جہادی کوششوں کے دوران جن اصلاحات نے جنم لیا ہے ان کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱-عقیدۂ توحید کی ترسیخ اور شرک سے بیزاری۔

سید صاحب نے شرک وبدعت کا استیصال اور توحید وسنت کی اشاعت کرکے ایک انقلاب برپا کردیا تھا، اس میں کم سے کم ہندوستان کی تاریخ میں آپ کا کوئی مثیل نہیں، آپ سے شرک وبدعت کی اس قدر بیخ کنی ہوئی کہ دوسرے دور میں ناممکن ہے، توحید وسنت پر لوگوں سے بیعت لیتے اور سب سے زیادہ اسی پر زور دیتے۔

۲-مشرکانہ رسوم کا ابطال۔

سید صاحب نے مشرکانہ رسوم کی تباہ کاریوں کو برملا کہا، اور اس کی بیخ کنی کی، آپ نے لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بیاہ بارات شادی غمی میں خداو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف شرک وبدعت کے رسوم کوئی نہ کرے، ہر امر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ پر نگاہ رہے۔

۳-شراب اور فسق وفجور سے توبہ۔

سید صاحب کی کلکتہ آمد کے بعد کلکتہ میں شراب کی دکانوں کا یہ حال ہوا کہ گاہک ندارد، دکانداروں نے جاکر انگریزی سرکار سے شکوہ کیا، کہ جب سے ایک بزرگ یہاں سے گزرے ہیں، تو اب کوئی ہماری دکان سے گذرتا نہیں، بے پردگی جو معاشرہ کا ایک حصہ بن چکی تھی، اور تلاش کرنے پر بھی کوئی خاتون پردہ پوش نظر نہیں آتی تھی، سید صاحب کی کوششوں سے تبدیلی آئی، گھر گھر پردے کا چلن ہوا۔

۴-فریضۂ حج کا احیاء۔

علوم عقلیہ میں غلو کی حد تک انہماک رکھنے والے بعض علماء نے حج کی عدم فرضیت کا اعلان کرد

File F:\Front.tif not found.

یا تھا، اور ہندوستان کے مسلمانوں کے ذمہ سے حج کے سقوط کا فیصلہ کر دیا تھا، راستے کے پر خطر ہونے اور درمیان میں سمندر کے حائل ہونے کو انہوں نے مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً کے منافی قرار دیا تھا، یہ ایسی دینی تحریف اور اتنا بڑا ایک فتنہ تھا کہ اگر بروقت استیصال نہ کیا جاتا تو آنے والے دنوں میں اس کا استیصال مشکل ہو جاتا، او راسلام کے اس عظیم الشان فریضے اور دین کے اس رکن کو دوبارہ زندہ کرنے میں مستقل تجدید و جہاد کی ضرورت پیش آتی، ان حالات میں سید صاحب کا علماء و مشاہیر کی ایک بڑی جماعت او رسیکڑوں مسلمانوں پر مشتمل ایک عظیم قافلے کو لیکر رخت سفر باندھنا ادائے فرض کے علاوہ حج کی فرضیت کا ایک اعلان اور اس کی عملی دعوت تھی، جس کی ان حالات میں سخت ضرورت تھی، یہ ضرورت آپ کے سفر سے پوری ہوئی۔

۵-نکاح کی ترویج

اس وقت بنگال میں کثرت سے رواج تھا کہ پہلا نکاح تو ماں باپ کرا دیتے اس کے بعد جس کا جی چاہتا کسی عورت کو اپنے گھر ڈال لیتا اور اس سے بغیر عقد و نکاح کے جسمانی تعلقات قائم کر لیتا چند متدین علماء اس خدمت کے لیے متعین ہوئے کہ بیعت کے بعد سو سو پچاس پچاس آدمیوں کو الگ بٹھا کر ان کے حالات دریافت کرتے جس عورت یا مرد کے تعلقات بغیر نکاح کے ہوتے اور وہ دونوں وہاں موجود ہوتے ان کا نکاح پڑھا دیا جاتا اور اگر دونوں میں سے کوئی غیر حاضر ہوتا تو اس کو طلب کیا جاتا اور نکاح پڑھایا جاتا۔

سید صاحبؒ کی جہادی فتوحات

سید صاحبؒ کی جہادی کوششوں سے جو نتائج سامنے آئے، اور جن نتائج نے خلافت راشدہ کے زمانے کی یاد دلائی وہ درج ذیل ہیں:

۱-اسلامی نظام کا قیام عمل میں آیا۔

۲-عدل و مساوات کا بول بالا ہوا۔

۳-ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا ہوا۔

۴-جہاد کے ساتھ ساتھ اصلاح نفوس کا بھی کام ہوا۔

۵-مجاہدین کی صفوں میں علماء صلحاء اور اتقیاء کی بڑی تعداد نظر آنے لگی۔

۶-مجاہدین کے دلوں میں دنیا سے بے رغبتی اور شہادت کا شوق بڑھا۔

سید صاحبؒ کے جہاد کا ہمہ گیر اثر

سید صاحبؒ عقائد و اعمال کی تصحیح، افراد کی تربیت، وعظ و تبلیغ اور جہاد و سرفروشی کے وسیع و طویل محاذ پر جس طرح سرگرم عمل رہے اس کا اثر صرف ان کے میدان کارزار اور ان کے معاصرین تک محدود نہ رہا بلکہ اس نے آئندہ کی نسلوں اور اپنے بعد آنے والے اہل حق۔

اصحاب دعوت او ردین کے علمبرداروں کے اوصاف پر گہرے نقوش چھوڑے، بڑھتے ہوئے انگریزی اقتدار کے مقابلہ اور ہندوستان او راس کے پڑوسی مسلم ممالک کی حفاظت کی جدوجہد کی ابتداء بھی آپ ہی نے کی، اس تحریک اور جدوجہد کی زمام قیادت ہندوستان میں اول اول انہیں کی جماعت کے علماء اور قائدین کے ہاتھ میں رہی، سید صاحب نے عقیدہ خالص کی دعوت پر اپنی تحریک کی بناء رکھی اور "أَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ" کی آواز اس جرأت اور بلند آہنگی سے بلند کی، جس سے دشت و جبل بھی گونج اٹھے، انہوں نے مسلمانوں میں ایمان و یقین، جذبۂ اسلامی اور جہاد فی سبیل اللہ کی روح پھونک دی، ایک بڑی جماعت کو داعیانہ اور مجاہدانہ بنیادوں پر منظم کیا، ان کی ایسی مستحکم اور جامع دینی تربیت کی جو زندگی کے تمام شعبوں پر محیط اور حاوی تھی، جسکی جڑیں ان کے دل و دماغ اور روح میں پیوست تھیں، انہوں نے مسلمانوں میں جوش ایمانی اور حمیت دینی پیدا کی، ان کے اندر ایک مومن کامل کی فراست و رہنمائی ایک قافلہ سالار کی عالی ہمتی و اولوالعزمی او رایک امام وقت کی جان فروش و جانبازی اور ایک دینی مصلح و مربی کی دلسوزی و دلسازی جھلک رہی تھی، جو اپنی عالی ہمتی، دور اندیشی، احساسات و خدمات اور عزائم و ارادوں میں نہ صرف اپنے عہد میں صف اول کے مدبر ہی اور ماہرین سیاست اور بانیان سلطنت سے آگے تھے بلکہ ان کے بعد سیاست دانوں کی رسائی بھی ان بلندیوں تک نہ ہو سکی جہاں ان کے شہباز فکر و عمل نے نیا آشیانہ بنایا تھا، یہ دراصل سنت نبوی کی ترویج، اسلام کے مٹتے ہوئے نشانات کے احیاء، جاہلیت کے مقابلہ میں اسلام اور بدعت کے مقابلہ میں سنت کا پرچم بلند کرنے، مسلمانوں میں احکام شریعت کے اجراء اور ان کو دین میں مکمل طور پر داخل ہونے کی دعوت تھی، جس میں کسی سیاسی مفاد، ذاتی مصلحت اور دنیا میں سربلندی و نام آوری کی خواہش بالکل شامل نہ تھی، اس وقت کے حالات اس بات کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ معاشرہ پوری طرح بگڑ چکا تھا، شرک و بدعت کی آماجگاہ بن چکا تھا اوہام و خرافات کا کالا سایہ اس کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا، عوام میں مشرکانہ عقائد و اعمال کا بول بالا تھا، توحید اور دین خالص پر پردے پڑتے چلے جا رہے تھے، اولیاء، صلحاء کی باتوں میں یہود و نصاری کا سا غلو پیدا ہوتا جا رہا تھا، وساطت اور تقرب بالاولیاء کا

File F:\Front.tif not found.

عقیدہ راسخ اور "مَانَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى" کا جاہلی خیال مسلمانوں میں ابھر رہا تھا، غیر اللہ کی دہائی دینے اور استغاثہ بغیر اللہ تک میں بہت سے علماء تک کو کوئی قباحت نظر نہیں آتی تھی، انبیاء وصالحین کی قبروں پر وہ سب کچھ ہونے لگا تھا، غیر مسلموں کے شعائر وخصوصیات اختیار کی جانے لگی تھیں، جس کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطرہ تھا، اور جس سے پوری شدت سے آپؐ نے منع فرمایا تھا۔

اس مشرکانہ جاہلیت کے خلاف جہاد کرنے اور توحید خالص کی طرف پوری قوت ووضاحت کے ساتھ دعوت دینے کے لئے ایک ایسے مجاہد کی ضرورت تھی جس کا ذہن توحید وشرک کے فرق کو خوب سمجھتا ہو، جو جاہلیت کو اس کے تمام لباسوں کے ساتھ پہچان سکتا ہو جس نے توحید کی حقیقت کو متأخرین کی کتابوں، جاہل مسلمانوں کے طرز زندگی اور زمانہ کے رسم ورواج کے بجائے براہ راست کتاب وسنت اور صحابہ کرامؓ کے عمل سے سمجھا ہو، جو صحیح عقیدہ کے اعلان کے اظہار میں حکومتوں کی مخالفت، اہل زمانہ کی عداوت، علماء کے اختلاف اور کسی کی ذرہ بھر پرواہ نہ کرتا ہو، جو کتاب وسنت اور دین کے مستند اور اولین مآخذ اور قرون اولی کے حالات پر گہری نظر اور کامل عبور رکھتا ہو، تیرہویں صدی ہجری کے لیے ایک ایسے ہی مرد کامل کی ضرورت تھی جو زندگی کے تمام میدانوں کا مرد میداں ہو، یہ مجاہد کبیر امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید کی ذات ہے جس نے ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر میں ایک ایسی حرکت پیدا کردی، جسکے اثرات صدیاں گزر جانے کے بعد بھی قائم ہیں۔

تیرہویں صدی یا اسلامی تاریخ کی پچھلی صدیوں میں دنیائے اسلام میں جو عالمگیر دینی اخلاقی سیاسی پستی نظر آئی ہے جس کی طرف قرآن کریم نے نہایت بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے: "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ" سید صاحبؒ کی کوششیں ان کے سامنے سد سکندری بن گئیں۔

سید صاحب کی تعلیم وتربیت کچھ ایسے ماحول میں ہوئی جو انسان کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کرنے میں اور اس کو بلندی تک پہونچانے میں معاون ومددگار ہوتے ہیں، سید صاحب کو بچپن ہی سے سپاہیانہ مشقیں کرنا پسند تھیں، اور سب سے بڑھ کر آپ کے اندر وہ بلند عادتیں بھی تھیں جس کی وجہ سے آپ معاشرہ کے محبوب بن جاتے تھے، جیسے کمزوروں کی مدد، بڑوں کی خدمت، بچوں سے شفقت اور آپ کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ نے خوب طاقت رکھی تھی کہ کئی کئی لوگوں کے کام آپ اکیلے کر لیا کرتے تھے، اس کے کئی واقعات ہیں، تفصیل کا موقع نہیں۔

جہاد، اس کے مقاصد اور اسباب

سید صاحب کی زندگی جس چیز کی آئینہ دار تھی اور جس نے آپ کو ایک امتیازی مقام عطا کر دیا تھا جس نے ماضی میں بلکہ کئی سو صدیوں پہلے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جماعت کی تربیت کی تھی، وہ ہجرت اور جہاد ہے یہ ایک ایسا روشن باب ہے جس نے صدیوں تک اپنے اثرات چھوڑے لیکن اصل چیز یہ ہے کہ وہ کون سے اسباب اور عوامل ہیں جن کی وجہ سے حضرت سید صاحب نے اتنا بڑا کام کرنے کی ہمت کی۔ حضرت سید صاحب .....الخ ایک مکتوب۔ (بنام سردار یار محمد خان) میں لکھتے ہیں:

"اس تمام جد جہد سے فقیر کا مقصد صرف یہ ہے کہ اہل کفر وضلالت سے جنگ کرنے کے بارے میں جو احکام وارد ہوئے ہیں اور فرمان خداوندی "جَاهِدُوْا بِأَمْوَالِكُمْ وَ أَنْفُسِكُمْ" (اپنے مال وجان کے ساتھ جہاد کرو) کی تعمیل کی صورت پیدا ہو فرماں بردار بندے کے لیے اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کے بغیر چارہ نہیں"۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"ہم محض رضائے الٰہی کے آرزومند ہیں، ہم اپنی آنکھوں اور کانوں کو غیر اللہ کی طرف سے بند کر چکے ہیں اور دنیا ومافیہا سے ہاتھ اٹھا چکے ہیں، ہم نے محض اللہ کے لیے علم جہاد بلند کیا ہے، ہم مال ومنال، جاہ وجلال، امارت وریاست، حکومت وسیاست کی طلب وآرزو سے آگے نکل گئے ہیں خدا کے سوا ہمارا کوئی مطلوب نہیں"۔

عصر حاضر میں شہدائے بالاکوٹ کا مقام وپیغام

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی "شہدائے بالاکوٹ کا مقام وپیغام" کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

".....بے شک شہداء بالاکوٹ کے خون نے دنیا کے سیاسی وجغرافیائی نقشہ میں کوئی فوری تغیر نہیں پیدا کیا، خون شہادت کی ایک مختصر سرخ لکیر ابھری تھی، اس کی جگہ نہ جغرافیہ نویس کے طبعی نقشہ میں تھی، نہ مؤرخ کے سیاسی مرقع میں، لیکن کسے خبر کہ یہ خون شہادت دفتر قضاء وقدر میں کس اہمیت واثر کا مستحق سمجھا گیا، اس نے مسلمانوں کے نوشتۂ تقدیر کے کتنے دھبے دھوئے، اس نے اللہ تعالی کے

File F:\Front.tif not found.

یہاں جس کے یہاں محو واثبات کا عمل جاری رہتا ہے "یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتَابِ" [الرعد:۳۹] کون سے نئے فیصلے کروائے، اس نے کسی مستحکم سلطنت کے لیے خاتمہ وزوال اور کسی پس ماندہ قوم کے لیے عروج و اقبال کا فیصلہ کروایا، اس سے کس قوم کا بخت بیدار ہوا اور کس سرزمین کی قسمت جاگی، اس نے کتنی بظاہر ناممکن الوقوع باتوں کو ممکن بنادیا اور کتنی بعید از قیاس چیزوں کو واقعہ اور مشاہدہ بنا کے دکھادیا۔

یوں تو شہدائے بالاکوٹ میں سے ہر فرد کا پیغام یہ ہے کہ "یَالَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ" مگر گوش شنوا اور دیدۂ بینا کے لیے ان کا مجموعی پیغام یہ ہے کہ ہم ایک ایسے خطۂ زمین کے لیے جدوجہد کرتے رہے، جہاں ہم اللہ کے منشاء اور اسلام کے قانون کے مطابق زندگی گذار سکیں، جہاں ہم دنیا کو اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرہ کا نمونہ دکھا کر اسلام کی طرف مائل اور اس کی صداقت اور عظمت کا قائل کرسکیں، جہاں نفس و شیطان، حاکم و سلطان اور رسوم و رواج کے بجائے خالص اللہ کی حکومت واطاعت ہو "وَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ"، جہاں طاعت وعبادت اور صلاح وتقوی کے لیے اللہ کی زمین وسیع اور فضا سازگار ہو اور فسق وفجور و معصیت کے لیے زمین تنگ اور فضا ناسازگار ہو، جہاں ہم کو صدیاں گذر جانے کے بعد پھر "اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ" کی تفسیر اور تصویر پیش کرنے کا موقع مل سکے، تقدیر الٰہی نے ہمارے لیے اس سعادت ومسرت اور اس آرزو کی تکمیل کے مقابلہ میں میدان جنگ کی شہادت اور اپنے قرب ورضا کی دولت کو ترجیح دی، ہم اپنے رب کے اس فیصلے پر رضامند اور خوش ہیں، اب اگر اللہ نے تم کو دنیا کے کسی حصے میں کوئی ایسا خطہ زمین عطا فرمایا، جہاں تم اللہ کے منشا اور اسلام کے قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی گذار سکو، اور اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرہ کے قائم کرنے میں کوئی مجبوری مخل اور کوئی بیرونی طاقت حائل نہ ہو، پھر بھی تم اس سے گریز کرو، اور ان شرائط و اوصاف کا ثبوت نہ دو، جو مہاجرین اور مظلومین کے اقتدار اور سلطنت کا تمغہ امتیاز ہیں: "اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ، اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ الْحَقِّ اِلَّا اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا، وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ" تو تم ایسے کفران نعمت اور ایک ایسی بدعہدی کے مرتکب ہوگے، جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے، ہم نے جس زمین کے چپہ چپہ کے لیے جدوجہد کی، اور اس کو اپنے خون سے رنگین کردیا، اکوڑے اور شیدو کے میدان اور توروا اور مایار کے رزم گاہ سے لے کر بالاکوٹ کی شہادت گاہ تک ہمارے خون شہادت کی مہریں ہیں، اور ہمارے شہیدوں کی قبریں ہیں تم کو خدا نے اس زمین کے وسیع رقبہ، سرسبز و شاداب خطے سپرد فرمائے اور بعض اوقات قلم کی ایک جنبش اور برائے نام کوشش نے تم کو عظیم سلطنتوں کا مالک بنادیا، "ثُمَّ جَعَلْنٰکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِھِمْ لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ" پھر ہم نے تم کو ان کے بعد زمین میں جانشین کیا، تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو، اب اگر تم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور تم نے آزادی کی اس نعمت اور خداداد سلطنت کی اس دولت کو جاہ و اقتدار کے حصول اور حقیر و فانی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا، تم نے اپنے نفوس اور اپنے متعلقین ملک کے شہریوں اور باشندوں پر خدا کی حکومت اور اسلام کا قانون جاری نہ کیا، اور تمہارے ملک اور تمہاری سلطنتیں اپنی تہذیب و معاشرت اور اپنے قانون و سیاست اور تمہارے حاکم اپنے اخلاق و سیرت اور اپنی تعلیم و تربیت میں غیر اسلامی سلطنتوں اور غیر مسلم حاکموں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے، تو تم آج دنیا کی ان قوموں کے سامنے جن سے تم نے مسلمانوں کے لیے الگ خطہ زمین کا مطالبہ کیا اور کل خدا کی عدالت میں جہاں اس امانت کے ذرہ ذرہ کا حساب دینا پڑے گا، کیا جواب دوگے؟ خدا نے تم کو ایسا نادر و ذریں موقع عنایت فرمایا ہے جس کے انتظار میں چرخ کہن نے سیکڑوں کروٹیں بدلیں، اور تاریخ اسلام نے ہزاروں صفحے الٹے جس کی حسرت و آرزو میں خدا کے لاکھوں پاک نفس اور عالی ہمت بندے دنیا سے چلے گئے اس موقع کو اگر تم نے ضائع کردیا تو اس سے بڑا تاریخی سانحہ اور اس سے بڑھ کر حوصلہ شکن اور یاس انگیز واقعہ نہ ہوگا، بالاکوٹ ان شہیدوں کا جو ایک دور افتادہ بستی کے ایک گوشے میں آسودہ خاک ہیں ان سب لوگوں کے لیے جو اقتدار و اختیار کی نعمت سے سرفراز اور ایک آزاد اسلامی ملک کے باشندے ہیں، پیغام ہے کہ: "فَھَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَکُمْ"۔

☆☆☆☆☆

File F:\Front.tif not found.

فقہ وفتاویٰ

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی

سوال : اگر کوئی شخص اپنی اولادوں میں سے کسی ایک کو اپنا پورا مکان اپنی حیات ہی میں دیدے اور دوسری اولادوں کو نہ دے تو کیا شرع میں اس کی گنجائش ہے؟ جس لڑکے کو دے رہے ہیں، والدین ان سے خوش ہیں اور جن کو نہیں دے رہے ہیں، ان سے والدین ناخوش ہیں، کیا والدین کے لیے ایسا کرنا درست ہے؟

جواب : اولاد کے درمیان عدل ومساوات ضروری ہے، کسی کو دینا اور کسی کو نہ دینا ظلم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کے درمیان مال کی تقسیم میں تفریق سے منع فرمایا ہے اور برابری کا معاملہ کرنے کا حکم دیا ہے: "اِتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْدِلُوْا فِیْ أَوْلَادِکُمْ"۔ [مسلم شریف، حدیث/۴۱۸۱]

سوال : ورثاء کے درمیان میراث کی تقسیم ہو، اور کوئی چیز بچ رہی ہو مثلاً گاڑی ہو اور ہر ایک لینے کا خواہشمند ہو، اس کی تقسیم کی کیا صورت ہوگی؟

جواب : مال متروکہ میں کوئی چیز تقسیم کے لائق نہ ہو تو ورثاء کے درمیان اس کی تقسیم کی صورت یہ ہے کہ اس کی قیمت لگا دی جائے اور قرعہ اندازی کر لی جائے جس کے نام قرعہ نکلے اسے وہ چیز دیدی جائے اور قیمت ہر ایک میں ان کے حصہ کے بقدر تقسیم کر دی جائے، حدیث شریف سے قرعہ اندازی کی اجازت ملتی ہے۔

[صحیح مسلم: ج۲/ص۲۸۶، حدیث ۶۲۹۸]

سوال : آجکل ہمارے ہندوستان میں لڑکیوں کی شادی میں لڑکے والوں کے مطالبہ پر کافی رقم یا جہیز کے نام پر کافی قیمتی سامان دینے پڑتے ہیں، کیا ان رقوم اور سامان جہیز کو میراث میں منہا کرنا درست ہوگا؟

جواب : وراثت کا تعلق ان اموال سے ہے جو مورث کی موت کے بعد بچ رہے ہوں، زندگی میں لڑکوں یا لڑکیوں کو جو کچھ دیا جاتا ہے وہ ہبہ کے حکم میں ہے، ہبہ کی وجہ سے وراثت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، جہیز یا تلک کی رقم وراثت میں منہا نہیں ہوگی اور لڑکیوں کو وراثت میں پورا پورا حق ملے گا۔

[بدائع الصنائع: ج۵/ص۹]

سوال : ایک شخص کا انتقال ہوا، جسکی کوئی اولاد نہیں ہے، وارثین میں بیوی اور بھائی وغیرہ ہیں، مورث کے پاس ایک ذاتی مکان ہے۔ اس مکان میں بیوی کا کتنا حصہ ہوگا؟ شوہر نے مہر ادا نہیں کیا تھا تو کیا مہر کے بقدر اس مکان میں حصہ ملے گا؟

جواب : مورث لاولد ہے اور ورثاء میں بیوی اور بھائی ہیں تو بیوی کا حصہ ایک چوتھائی ہوگا بقیہ مال بھائیوں کو ملے گا، لیکن وراثت کی تقسیم سے قبل مہر ادا کرنا واجب ہے، مکان کی قیمت لگائی جائے گی مہر کے بقدر قیمت الگ کرنے کے بعد بقیہ رقم چار حصوں میں تقسیم ہوگی ایک حصہ بیوی کو ملے گا، اور بقیہ تین حصے بھائیوں کو ملیں گے، گویا بیوی کو مہر کی رقم پھر باقی ماندہ میں ایک چوتھائی رقم ملے گی: "وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَمْ يَكُنْ وَلَدٌ" [سورہ نساء: ۱۲] (اگر اولاد نہ ہو تو تم نے جو کچھ چھوڑا ہے اس میں بیویوں کو ایک چوتھائی حصہ ملے گا)۔

سوال : ایک عورت کا انتقال ہوا، اس کے ورثاء میں صرف ایک لڑکا اور شوہر ہے، مال متروکہ کی تقسیم کیسے ہوگی؟

جواب : عورت کے ذمہ اگر قرض ہو تو اس کی ادائیگی کی اگر وصیت کی ہو تو ایک تہائی میں وصیت نافذ کرنے کے بعد جو مال بچ رہا ہو اس میں شوہر کو ایک چوتھائی حصہ ملے گا، اور بقیہ لڑکوں میں تقسیم ہوگا: "فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَا أَوْ دَيْنٍ" [سورہ نساء: ۱۲] (اگر اولاد ہو تو تم کو ایک چوتھائی حصہ ملے گا بیوی کے چھوڑے ہوئے مال میں وصیت اور قرض ادا کرنے کے بعد)۔

سوال : ایک پاگل شخص (جن کی کئی اولادیں ہیں) کے والد کا انتقال ہو گیا ہے، انہوں نے جائیداد منقولہ وغیر منقولہ سب چھوڑا ہے، ورثاء آپس میں تقسیم کر رہے ہیں لیکن پاگل کی اولادوں کو نہیں دے رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ پاگل کو وراثت میں حصہ نہیں ملتا ہے؟ اس بارے میں اسلامی شریعت میں کیا حکم ہے؟

جواب : پاگل بھی وارث ہوتا ہے اور مورث کے مال متروکہ میں اس کو بھی حصہ ملے گا، اس لیے پاگل کی اولاد مذکورہ صورت میں اپنے والد کا حصہ لینے کی حقدار ہے۔ [الدر مع الرد: ج۱۰/ص۵۰۳]

سوال : ایک شخص کا انتقال ہو گیا ہے، ان کے وارثین موجود ہیں، کیا کوئی وارث دیگر ورثہ کی اجازت کے بغیر مرحوم کے مال متروکہ میں سے برائے ایصال ثواب فقراء پر خرچ کر سکتا ہے؟

جواب : اگر مال مشترک ہو، تقسیم شدہ نہ ہو تو تمام ورثاء کی اجازت کے بغیر تنہا کوئی وارث تصرف نہیں کر سکتا خواہ کار خیر ہی کیوں نہ ہو۔ [حوالہ سابق]

☆☆☆☆☆

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

باسمہ تعالیٰ

اہل خیر حضرات سے!

خدا کا شکر ہے کہ ہم ان بیش قیمت اصولوں کو سینہ سے لگائے ہوئے ہیں جن کے لیے دارالعلوم قائم کیا گیا تھا یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین و دنیا کی جامعیت اور علم و روحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور علوم اسلامیہ کی برتری و امتیاز کا اعلان و اظہار، دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت، ہمارے نزدیک مالیات، بجٹ اور عظیم الشان عمارتوں کے مقابلہ میں ان مذکورہ مقاصد کا حصول زیادہ اہم ہے، مسئلہ کی اس قدر تشریح اور وضاحت کے بعد اب مزید کچھ کہنے کی حاجت نہیں۔

ان گذارشات کے بعد آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دارالعلوم کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون و اعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائیدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں، آپ میں سے جو لوگ ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن میں شریک تھے، ان کو یاد ہوگا کہ ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے غیر ملکی معزز عرب مہمانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''یہ سونے کی چڑیاں سب اُڑ جائیں گی، ہم اور آپ یہاں رہیں گے، آپ یہ نہ سمجھیں کہ اب آپ کو چھٹی مل گئی، ہم آپ کو چھوڑنے والے نہیں، ہمارے سفیر آپ کے گھروں پر جائیں گے، آپ کے چار آنے، آٹھ آنے ہم کو عزیز ہیں، یہ جو کچھ دیں گے وہ اس دولت کا ہزارواں حصہ ہوگا جو خدا نے ان کو دیا ہے، اور جو آپ دیں گے وہ آپ کے گاڑھے پسینہ کی کمائی ہوگی۔''

ہندوستان کے مسلمانوں سے خواہ وہ اس طویل و عریض ملک کے کسی علاقہ کے ہوں، ہماری مکرر درخواست ہے کہ وہ اس کام کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کو اپنا ہی کام سمجھیں، ہمیں یقین ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات عالی پر پورا بھروسہ ہے کہ ان شاء اللہ ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کی بیش قیمت رہنمائی و نظامت میں اگر احباب و مخلصین نے پوری دلچسپی لی تو ہمارا یہ پیغام نہ صرف ملک کے بلکہ عالم اسلام کے کونے کونے میں پہنچے گا، وما ذلك على الله بعزيز.

(مولانا) محمد واضح رشید ندوی	(پروفیسر) اطہر حسین	(مولانا) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) محمد حمزہ حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

نوٹ: چک/ ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں: **NADWATUL ULAMA**

(عطیات) **A/C NO. 10863759711**

(زکوٰۃ) **A/C NO. 10863759766** (State Bank of India Main Branch, Lucknow.)

اور اس پتہ پر ارسال کریں:

NAZIM NADWATUL ULAMA,
NIZAMAT OFFICE, NADWATUL ULAMA,
TAGORE MARG, LUCKNOW - 226007 (U.P.)

Phone : (91-522) 2741231, 2741316, 2740151, Fax : 2741221
E-mail address : nadwa@sancharnet.in/ website : www.nadwatululam.org.